گنگا بہے نہ رات

کرشن چندر

گنگا بہے نہ رات

(ناول)

کرشن چندر

ایشیا پبلیشر
اے 36۔ چیتک اپارٹمنٹس۔ پلاٹ نمبر 27/2
سیکٹر 9۔ روہنی۔ نئی دہلی 85

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتابت ـــــــــ محمد عارف
اشاعت ـــــــــ ۱۹۹۹ء
قیمت ـــــــــ ۱۲۵ روپے
طباعت ـــــــــ فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دھلی

Ganga Bhe Na Raat
by
Krishan Chander

Price : - 125/-

Asia Publisher's
A-36, Chetak Apartments
Plot No. 27/2 Sector-9
Rohini, Delhi-110085
Tel : - 7261823

میرا نام موتی لال ناگر ہے ۔ میرے باپ رائے بہادر پیارے لال ناگر انگریزوں کے زمانے میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے منظور نظر بھی تھے وہ تو اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سے بھی بڑا حاکم بنانا چاہتے تھے مگر میں نے پڑھ کے نہیں دیا ۔ گھسٹتے گھسٹتے انٹرنس پاس کیا ۔ کالج بھی گیا ۔ تو دو سال ایف ۔ اے میں فیل ہوا ۔ پھر تین سال بی ۔ اے میں، پھر پڑھنا چھوڑ دیا اور گھر بیٹھ گیا ۔ جیسے بیوائیں میکے میں بیٹھ جاتی ہیں ۔

مگر میرے باپ نے ہار نہیں مانی ۔ کبھی تو انھوں نے تحصیلداری میں دھکیلنا چاہا ۔ کبھی نائب تحصیلداری میں ۔ کبھی پولیس میں ۔ کیوں کہ مجھے ایک عرصے تک شکار کا بہت شوق رہا ۔ دیکھنے میں ٹھیک لگتا ہوں ۔ اونچا پورا قد ۔ تندرست جسم ۔ بھرے ڈیل ڈول والا رنگ کھلتا ہوا ۔ اور آنکھیں بڑی بڑی مگر دماغ میں کوڑا بھرا ہے ۔ قانون کی دفعات اور پولیس والوں کی گھات کسی طرح پلے نہ پڑی ۔ اور ہر امتحان میں بڑے شاندار طریقے سے فیل ہوتا رہا ہوں ۔ دراصل مجھے حاکمیت اور اس کے انتظامیہ امور سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ۔ مجھے رنگ پسند ہیں اور رات کے سناٹے میں بہنے والے جھرنوں کا مدھم سنگیت اور آسمان کے لاجوردی فرش پر ہولے ہولے پگ دھوتی ہوئی نازک بدلیاں جو سفید شفاف اوڑھنیاں پہنے جانے کس مندر کو جاتی ہیں؟ اور جب سب سو جاتے ہیں ۔ تو رات میرے سرہانے کھڑے ہو کر

ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے ۔ اور میں اکثر بیاکل ہو کر اپنے قصبے کے پرانے خاندانی گھر سے نکل کر جنگل کی طرف چلا جاتا ہوں اور ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ کر عجب عجب سی آوازیں سنتا ہوں ۔ ایسی آوازیں جو انگلیوں کی طرح میرے دل کو ٹٹولتی ہیں اور میرا دل ایک عجیب و غریب ارغنوں کی طرح بجنے لگتا ہے ۔ اور میں ایک چھوٹا سا آدمی ایک بہت بڑی انجانی، ان دیکھی، دُنیا کی طرح کھلنے لگتا ہوں ۔ اور ٹیلے اور جنگل ۔ اور رات اور مدہوشی تاریکی اور سناٹے پر محیط ہو جاتا ہوں ۔ چاندنی کی طرح ہلکا محسوس کرتا ہوں اور غم کی طرح سیال ۔ کائنات کی مبہم اور درد کی طرح پراسرار چاندنی ندی کی طرح بہتی ہے اور میں اس کے ساتھ بہتا ہوں ۔ مور پنکھ کھول کے ناچتا ہے اور میں اس کے ساتھ ناچتا ہوں ۔ مجھے چاندنی کی سطح پر کسی کے گلابی چرن کمل چلتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ دو پاؤں، سبک نازک ۔ غزل کے دو مصرعوں کی طرح آگے پیچھے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اور کسی کی سفید ساڑی کا کالا کنارہ نظر آتا ہے ۔ اور میں اور جنگل کا مور گھنٹوں چاندنی میں ان دو چلتے ہوئے گلابی پاؤں کو دیکھ دیکھ کر مبہوت سے ہو جاتے ہیں ۔ رات ایک پیرہن کی طرح چاندنی کے فرش پر اپنا کالا لبادہ اوڑھے بیٹھی ہے ۔ اور مجھے انتظار ہے ۔ میں ۔ مور اور رات تینوں منتظر ہیں ۔ جانے کس کے؟ جانے میرے دماغ میں کوئی کوڑا بھرا ہے کہ خواب بھرے ہیں ۔ کہ سپید سپید دھندلی گھٹائیں بھری ہیں کہ اس دُنیا کی کوئی حقیقت ہاتھ نہیں آتی ۔ ہر وقت دل دکھتا سا رہتا ہے ۔ جانے کس کے لئے! اور ہاتھ کسی کے چہرے کو ٹٹولنے کے لئے ڈھونڈتے ہیں ۔ اور یہ دُنیا جتنی سمجھ میں آتی ہے اس سے کہیں زیادہ پر اسرار دکھائی دیتی ہے یا ایسا لگتا ہے کہ اس دُنیا سے پرے بھی کوئی دُنیا ہے ۔ یا اس دُنیا ہی کے اندر ایک اور دُنیا ہے ۔ ان رنگوں سے پرے کئی ان دیکھے رنگ ہیں ان آوازوں سے آگے کئی ان سُنی آوازیں ہیں ۔ دُنیا میں یہ کھیت ہے ۔ یہ جنگل ہے ۔ یہ گھر ہے ۔ یہ کسان ہے ۔ یہ وطن ہے ۔ یہ فاصلہ ہے ۔ یہ کشش ہے ۔ یہ نفرت ہے ۔ یہ رات ہے یہ صبح ہے ۔ مگر جانے مجھے کیا ہو گیا ہے ۔ مجھے وطن مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے ۔ فاصلہ محسوس نہیں ہوتا رات میرے لئے ایک لمبے سفر کا بُلاوا معلوم ہوتی ہے ۔ اور ہر صبح کو میں سوچتا ہوں کہ آج میں

افق کے کنارے سے سورج کے نہ جانے کس کے گلابی چرن بھرتے ہوئے دیکھوں گا اور جب نہیں دیکھتا تو دل مایوسی سے بیٹھنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے افق کا کنارہ اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالوں۔ اور ان قدموں کو دیکھ لوں جو کرنوں کی سنہری پائل پہنے مجھ سے دور کہیں ناچنے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی میں اپنے احساس کی شدت سے بے دم سا ہو جاتا ہوں۔ لگتا ہے میں پاگل ہوں۔ یا کسی دوسری دُنیا سے آیا ہوں۔ اور اپنے باپ سے اور ماں سے میرا کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہے۔ ایک بدلی کی طرح میں کہیں سے آیا ہوں۔ ایک ساعت کے لئے اس ٹیلے پر آن ٹکا ہوں۔ دوسرے لمحے میں اُڑ کر کہیں چلا جاؤں گا۔

میرے باپ کی موروثی جائداد بہت تھی۔ اور بہت کمائی بھی کی تھی انھوں نے۔ گھر میں ہر طرح سے فراغت تھی۔ میرے والد نے مجھے جائداد سنبھالنے کے کام میں لگانا چاہا۔ مگر میرا دل اس میں بھی نہ لگا۔ پھر میں نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی۔ مگر ہر راگ راگنی کے اصول میرے ذہن میں بیڑیاں بن کر جم گئے۔ پھر میں نے عورتوں سے عشق کرنا چاہا۔ مگر ہر لڑکی کا چہرہ مہرہ مانوس اور پُرانا سا معلوم ہوا۔ جیسے برسوں سے میں اس کی ہر خواہش اور دل کے ہر تار کو جانتا ہوں۔ کہیں مجھے وہ اجنبیت نہ ملی جو مجھے پُراسرار راہوں پر لے جاتی۔ پھر میں نے کتابوں میں دل لگانا چاہا۔ اور اپنے والد کی وسیع لائبریری سے سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہر کتاب ایک پُراعتماد مرد کی طرح اپنے آپ میں مگن اور پُرغرور دکھائی دی۔ ہر کتاب کسی شہری حسینہ کی طرح بہترین میک آپ سے آراستہ، بہترین ملبوس میں جگمگاتی ہوئی، ہزار عشوے دکھاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ہر کتاب ہاتھ میں جھاڑو لئے میرے دماغ کے ہر جالے کو صاف کرنے کے لئے کھڑی نظر آئی۔ میں کتابوں سے بھاگ نکلا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ اپنے خوابوں میں پناہ لینے لگا۔

پھر مجھے رنگ مل گئے۔

اور جب مجھے رنگ ملے تو میری دُنیا ہی بدل گئی۔ کاغذ کی سطح یکایک ایزل سے غائب ہو گئی۔ اور رنگ ہی رنگ رہ گئے۔ رنگ، جو آپس میں جب مل جاتے تھے تو اور ہی رنگ پیدا کرتے تھے۔ میں کاغذ پر اپنی دُنیا کو ایک نقطے کی طرح چھوٹا کر سکتا تھا۔ اور کائنات کی طرح وسیع۔ یہ رنگ جو دو گلابی چرن کملوں کی طرح ناچتے تھے اور مجھے مسحور کر لیتے تھے۔ یہ رنگ جو کبھی تو پھولوں کی طرح مہکتے تھے اور کبھی کسی انجانی راگنی کی طرح سنائی دینے لگتے تھے۔ ان رنگوں کی دُنیا بڑی پُراسرار اور اجنبی تھی۔ اور اس راستے پر میرا اگلا قدم پہلے سے مختلف تھا۔ ہر موڑ الگ اور ہر صورت سے مختلف۔ ان رنگوں کے اندر جتنا میں اترتا گیا اتنی ہی گہرائی مجھے اور ملتی گئی۔

میں رنگوں میں ڈوب گیا۔

میرا باپ میری تصویر کو سمجھ نہ سکا۔ کیوں کہ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ وہ حقیقت کے کانچ کے شفاف فانوس کی چکنی سطح پر اپنے پر پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے فانوس کے اندر جا کر جلتی ہوئی روشنی سے کبھی اپنے پر نہ جلائے تھے۔ اور وہی آرام دہ قسمت اپنے بیٹے کو ودیعت کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ کوئی دوسری زندگی جانتا بھی نہ تھا۔ اور جو سکون اور خوشی وہ جانتا تھا وہی اپنے بیٹے کو دینا چاہتا تھا۔ اس کی نیت اچھی تھی۔ اور اسی طرح تمام اچھی نیتوں کے دروازے جہنم میں کھلتے ہیں۔ میرے باپ میرا رجحان دیکھ کر مجھے محکمہ آثارِ قدیمہ میں نوکر کرا دیا۔ میرا کام پرانے آثار کی دیکھ بھال کے علاوہ ان کی تصاویر بنانا بھی تھا۔ ان کے مختلف حصوں کی بھی، اور ان جگہوں کی بھی جہاں جہاں پُرانی گُل کاری، مینا کاری کے نمونے ملتے تھے یا پُرانے سٹائل کی تصویریں دیواروں پر کندہ تھیں اور جو اب امتدادِ زمانہ سے معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کام میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی اور میں بخوشی اس کام کے لئے راضی ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پرانے آثار سے مجھے گہری دلچسپی سی محسوس ہونے لگی۔ اور میرے وقت کا زیادہ حصہ ان کی دیکھ بھال، مصوری اور خاکہ نویسی میں گزرنے لگا۔ میرے لئے اردگرد کی دُنیا نامانوس ہوتی

گئی اور ماضی کے نقوش زیادہ مانوس اور جانے پہچانے سے نظر آنے لگے اور میں پہلے سے بھی زیادہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ماضی کے نقش میرے لئے ہر دم زندہ اور متحرک ہو کر سامنے آنے لگے۔ میرے والد نے مجھے زمانۂ حال میں کھینچنے کی بہت کوشش کی۔ دو تین جگہ میری شادی کی بات بھی چلائی۔ مگر میں نے سختی سے انکار کر دیا میرے ماں باپ تھک ہار کر چُپ ہو گئے انھوں نے اُمید تو نہیں چھوڑی۔ ہاں اتنی تسلی .... انھیں ضرور تھی کہ لڑکا کام سے لگ گیا نوکری کرتا ہے۔ دن رات اپنے کام میں منہمک رہتا ہے۔ اس کے افسر اس سے بے حد خوش ہیں ان پانچ سالوں میں اسے دو مرتبہ ترقی ملی ہے۔ اور وہ اپنی غیر معمولی استعداد اور کارکردگی کی بدولت اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لا کر اپنی ماں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کسی طرح کی آوارگی یا بدچلنی کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے۔ تسلی کے لئے یہ بہت ہے۔

سن انیس سو اٹھاون کے جولائی کے پہلے ہفتے میں مجھے محکمے کی طرف سے بیدروارہ جانے کا حکم ملا۔ بیدروارہ کی ہمالیائی وادی میں محکمے نے کچھ نئے غار دریافت کئے تھے۔ جن میں کانگڑہ سکول کی مصوری کے کچھ نادر نمونے ملے تھے۔ محکمے نے مجھے ان تمام تصاویر کی رنگین نقلیں اُتارنے کے لئے روانہ کیا۔ کام بے حد اہم تھا۔ اور میرے شوق کے عین مطابق تھا۔ محکمے کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی اس سے میں بھی خوش تھا میرے گھر والے بھی۔ بہت جلدی مجھے ضروری ساز و سامان سے لیس کر کے روانہ کر دیا گیا۔ چلتے وقت ماں جی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ کیوں کہ راستہ پہاڑی اور دشوار گزار تھا اور مجھے کئی ماہ گھر سے باہر رہنا تھا۔

آلوک پور تک ریل جاتی ہے۔ آلوک پور سے تیراہ تک بس جاتی ہے۔ آگے بس بھی نہیں جاتی۔ تیراہ کے قصبے میں آخری ڈاک خانہ ہے تیراہ سے بیدروارہ کا گاؤں

بیس میل کی دوری پر ہے۔ دشوار گزار گھاٹیوں پر گھنے جنگل کھڑے ہیں۔ اور پُر شور تیز رفتار بہتی ندیوں کو پیدل چل کر عبور کرنا پڑتا ہے۔ راستے میں نہ کوئی پُل ہے نہ سڑک، بس جنگلی راستے ہیں یا گڈریوں کی ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیاں ہیں۔ جن پر خچر بھی مشکل ہی سے بار برداری کے کام میں لائے جا سکتے ہیں میں نے تیراہ کے قصبے سے دو خچروں پر سامان لادا۔ دو مرتبان چار قلی اور ایک مقامی باشندے کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ لیا اور بیدروارہ کی گھاٹی کا سفر پیدل اختیار کیا۔

پہلی رات تیراہ سے سات میل دور گرتون کے پہاڑ کی چوٹی کے قریب کاٹی۔ جہاں جنگل ختم ہوتا ہے اور گرتون کی برف پوش چوٹی کی چڑھائی شروع ہوتی ہے وہاں بڑے بڑے دیواروں کے کنج میں ایک قدرتی پہاڑی کھوہ ہے جس کے اندر سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک چشمہ اُبلتا ہے۔ اور چٹخے کے کنارے کھوہ کے اندر ہی جگہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہمارا قافلہ بخوبی سما سکتا تھا۔ یہاں پر اندر کی دو چٹانوں کے جُڑ جانے سے ایک طرف ایک قدرتی چولھا سا بن گیا تھا۔ جس کے اندر ابھی جلی لکڑیوں کے ٹکڑے ابھی تک پڑے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کھوہ کو بیدروارہ کی وادی کی جانب جانے والے لوگ اکثر کام میں لائے ہیں۔ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے قلیوں نے کھانا پکایا۔ پھر کھوہ کے فرش پر بستر بچھا کر سب سو گئے۔

رات کو دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ جنگل کا سناٹا کبھی تو اتنا گہرا ہو جاتا کہ ایک بوجھ بن کر سینے پر برف کی طرح جمنے لگتا۔ کبھی اس کالے سناٹے میں تاریک لبادے اوڑھے ہوئے چند مبہم پر اسرار دھندلی دھندلی صورتیں کھوہ کے باہر سر جوڑ کر میری طرف دیکھ دیکھ کر خسر پھسر کرتی نظر آتیں۔ کبھی جنگل کی ہوا سائیں سائیں کرتے ہوئے، دھیرے دھیرے

کراہتے ہوئے معلوم ہوتی۔ کبھی ہوا کا شور اس قدر بڑھ جاتا کہ وہ جنگل کے درندوں کی طرح درختوں اور چٹانوں سے جھگڑتی ہوئی معلوم ہوتیں۔

رات کو معلوم نہیں کب میری آنکھ کھلی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی کے ٹھنڈے ٹھنڈے نتھنے میرے ماتھے سے مس ہو رہے ہیں کوئی تیز تیز سانسوں سے مجھے سونگھ رہا ہے۔ کسی کی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں گہری چمکتی ہوئی مجھے دکھائی دیں۔ مگر نیند اس قدر گہری تھی کہ میں مکمل جاگ نہیں سکا۔ نیم غنودگی یا جیسے سپنے میں میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہو۔ صبح اُٹھا تو کچھ یاد بھی نہ تھا۔ ہاں صبحدم جب تیار ہو کے ہمارا قافلہ کوچ کرنے لگا تو مقامی باشندے اور گائیڈ حیس کا نام مینا تھا، مجھے بتایا کہ پھلوں کی ٹوکری غائب ہے۔ جس میں سیبوں کے علاوہ بادام اور اخروٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ معاً مجھے رات کا واقعہ یاد آیا۔ کھوہ کے باہر پنجوں کے نشان بھی ملے۔ جنھیں پہچان کر مینا نے کہا کہ جنگلی ریچھ تھا۔ اس پر ایک قلی کو قدرے یاد آیا کہ رات کو کسی وقت ایک خچر نے بہت بے چینی دکھائی تھی۔ غالباً اسی وقت ریچھ اندر آیا ہوگا اور پھلوں کی ٹوکری لے کر فرار ہوگیا ہوگا۔ خیریت گذری کہ ریچھ نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔ میں چشم تصور میں اس ریچھ کو مزے سے سیب کھاتے اور اپنے دانتوں سے اخروٹ اور بادام توڑ کر گری نکال کر مزے سے چباتے دیکھ رہا تھا۔ اس ریچھ کی آنکھیں بہت چمکدار اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اور وہ اس وقت بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔ مجھے ایک دم وہ ریچھ بہت پسند آنے لگا۔ اگر مل جاتا تو یقیناً میں اس سے ہاتھ ملاتا اور ہم دونوں دو پرانے دوستوں کی طرح بادام اور اخروٹ کی مختلف قسموں پر باتیں کر سکتے تھے۔

دوسری رات مان سہرہ ندی کے کنارے بسر ہوئی۔ گرتون پہاڑ کی دوسری جانب خطرناک اترائیوں کے بعد یکایک مان سہرہ ندی کا چھوٹا سا نیلا پاٹ دکھائی دیتا ہے۔ اس ندی کے دوسرے کنارے سے بیدرواہ کا پہاڑ شروع ہوتا ہے۔ جس کے دوسری

جانب بیدرواہ کی وادی واقع ہے۔ مان سہرہ ندی کے دونوں جانب گرتون اور بیدرواہ کے جنگل خطرناک گھاٹیوں پر کھڑے ہیں۔ یہاں دن کو بھی شام کی سی کیفیت رہتی ہے۔ گھنے جنگلوں میں دھوپ بھی منہ چھپائے پھرتی ہے۔ اور مان سہرہ ندی ان دو پہاڑوں کے بیچ میں پگھلی ہوئی برف کا نیلا پیرہن پہنے ہوئے کسی وحشی گذریا لڑکی کی طرح شور مچاتی ہوئی گیت گاتی ہوئی نیچے کی گھاٹی کی طرف گذر جاتی ہے لگتا ہے کہ مان سہرہ ندی کو کسی نے رام نہیں کیا۔ اس کے کنارے نہ دھان کے کھیت ہیں۔ نہ مکئی کے۔ دونوں کناروں پر دو پہاڑ آمنے کھڑے ہوئے ہیں اور دو خونخوار رقیبوں کی طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔ اور ان دونوں کے بیچ میں مان سہرہ ندی کسی شریر چنچل پہاڑی دوشیزہ کی طرح ہنستی ہوئی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزر رہی ہے۔ مان ہی چھوٹی کنواری ندی ہے۔ کسانوں نے اس سے پانی نہیں لیا۔ کھیتوں نے اپنی پیاس نہیں بجھائی۔ اس کے کنارے کوئی پن چکی بھی نہیں ہے۔ کوئی گاؤں بھی نہیں ہے۔ دور نیچے جا کر شاید وہ کہیں بڑی ہو جائے گی۔ یکا یک جوان ہو جائے گی جوان کسان اس سے محبت کریں گے۔ اس کے ماتھے پر دھان کی بالیوں کے تاج پہنائیں گے۔ عورتیں اس کے کنارے گیت گائیں گی۔ دیئے جلائیں گی۔ پھول تیرائیں گے۔ اور اسے مٹی کی ڈولی (گگریا) میں بٹھا کر اپنے گھروں میں لے جائیں گی۔ مگر ابھی تو وہ کنواری ہے۔

مان سہرہ ندی کے کنارے گذریوں کا ایک قافلہ آ کے رُکا تھا۔ وہ ہمیں نہیں جانتے تھے۔ ہم انھیں نہیں جانتے تھے۔ اس لئے بڑی بے غرض رات تھی۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا۔ ہم نے انھیں دیا۔ جو کچھ ان کے پاس تھا۔ انھوں نے ہمیں دیا۔ شاید ایک رات کا ملاپ زندگی کے ملاپ سے زیادہ گہرا ہوتا تھا۔ کیوں کہ کل صبح دونوں اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔ جب جُدائی یقینی ہو تو محبت بڑھ جاتی ہے۔ ایک ایک پل قیمتی معلوم

ہوتا ہے۔ اس رات سرسا اور تامنی نے ایک ناچ کیا، لاڈو اور جمنی نے گیت گائے تھے۔ وہ بُڈھا گڈریا جو بانسری بجاتا تھا۔ مان سہرہ ندی کا باپ معلوم ہوتا تھا۔ پہاڑی گیت میری سمجھ میں نہ تھا۔ مگر کیا گیتوں کو صرف لفظوں ہی سے سمجھا جا سکتا ہے؟ وہ تان بھی تو کچھ کہتی ہے۔ وہ سریلی سسکی جو گلے میں ایک ندی کی طرح بہتی ہے۔ وہ آنکھیں جو صدیوں پرانی کہانی کہتی ہیں۔ جب مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک پاک اور صاف جذبہ ہوتا تھا۔ اور بیچ میں کوئی بینک نہ ہوتا تھا۔ کوئی جہیز نہ ہوتا تھا اور کسی سے یہ نہ پوچھنا تھا کہ تیری جات کیا ہے؟ اور تو نے مجھے کیا دیا اور میں نے تجھ سے کیا لیا؟ ان کے ساتھ گیت گاتے ہوئے۔ کھانا کھاتے ہوئے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پاتال میں اُترتے ہوئے مجھے عجب قربت کا احساس ہوا۔ ہمیشہ مجھے اجنبیوں کے ساتھ اس گہری قربت کا احساس کیوں ہوتا ہے۔ ان سانولیوں کی ہنسی میرے اتنے نزدیک کیسے ہوگئی تھی۔ اچھا ہوا صبح سویرے میرے جاگنے سے پہلے ان کا قافلہ اُٹھ کر چلا گیا۔ اور میرے لئے ایک رات کی ایک ایسی یاد چھوڑ گیا جو شاید میں نے کسی دوسری زندگی میں کسی انجان جزیرے میں گزاری تھی۔ ایسا کیوں لگتا ہے۔ جیسے میرا ان کا کوئی گہرا بندھن تھا۔ جسے اب ٹھیک طرح سے بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے

دوسرے دن بیدرواہ پہاڑ کے دوسری طرف اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے۔ مگر دل رہ رہ کر پھر مان سہرہ ندی کے اسی کنارے پر پہنچ جاتا تھا۔ جسے ہم اب بہت دور پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ بیدرواہ کا اس طرف کا جنگل بہت گھنا ہے اور بہت پرانا بھی معلوم ہوتا تھا اور انسانوں کی روزمرہ کی آمدورفت سے بہت دور بھی معلوم ہوتا ہے۔ جن بیخوف نگاہوں سے جنگل کے جانور ہمیں دیکھتے تھے ان کی نگاہیں ہمیں یہ بتا دینے کے لئے کافی تھیں کہ اس جنگل میں سرکار کی طرف سے شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ نظریں انسان کی

درندگی سے ابھی تک ناآشنا تھیں۔ دل کو ایک عجیب طرح کا سکون محسوس ہوا۔

خیال تھا کہ دوپہر تک ہم منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ مگر جنگل اس قدر گھنا اور راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ دوپہر تک بڑی مشکل سے بیدرواہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ سکے۔ چوٹی پر پہنچ کر بیدرواہ کی وادی کا حسین منظر دکھائی دیا۔ یہاں آکر پہاڑ کی مٹھی کھل سی گئی تھی۔ اور ان پہاڑوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی وادی ہتھیلی کی طرح کھلی نظر آتی تھی۔ اس ہتھیلی میں رو پہلی نیلی ندیاں قسمت کی لکیروں کی طرح دھان کے کھیتوں میں پھیلتی ہوئی شمال سے آکر جنوبی کنارے پر آکر مل جاتی تھیں۔ دو جگہ آکے ملتی تھیں۔ ایک تو وادی کے بیچ میں جہاں ایک اونچا ٹیلہ تھا اور اس ٹیلے پر ایک پرانا راجپوتی وضع کا قلعہ نظر آرہا تھا۔ دونوں ندیاں اس ٹیلے کے گرد طواف کرتی ہوئی مل جاتی تھیں اور مل کر پھر الگ ہو کے دھان کے کھیتوں میں بکھر جاتی تھیں۔ دوبارہ جنوب کی جانب ملتی تھیں۔ یہاں پر دونوں ندیوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا جزیرہ بن گیا تھا۔ جس کے اندر درختوں سے گھرا ہوا ایک پرانا مندر نظر آتا تھا۔ اور اس وقت دھوپ میں اس کا پیتل کا کلس سونے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ دھان کے کھیتوں کے پار گھاٹی پر بیدرواہ کا چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ اور اس کے شمالی جانب پہاڑی سلسلے کے اندر کالے کالے دھبوں کی طرح غار معلوم ہو رہے تھے۔ یہ غالباً وہی غار تھے جن کی رنگین نقلیں لینے کے لئے مجھے تہذیب و ترقی کے جدید ٹھکانوں سے اس قدر دور بھیجا گیا تھا۔ ان غاروں کے متعلق پوچھنے پر میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔

مگر اتنی دوری اور بلندی سے دیکھنے پر مجھے سب سے دلچسپ جگہ وہی محسوس ہوئی جہاں ایک اُونچے ٹیلے پر وہ راجپوتی قلعہ کھڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ قلعہ پوری وادی کے ماحول پر چھایا ہوا ہے۔ قلعے کی دیواریں بہت پرانی معلوم ہوتی تھیں اور ان پر گہری کائی جمی ہوئی تھی۔ جس سے قلعے کی رنگت پتھریلی دکھائی دینے کے بجائے سیدھی مائل سبز دکھائی دیتی تھی۔ جیسے یہ قلعہ بھی جھاڑ جھنکاڑ کے ساتھ درختوں، پودوں اور انگور کی لٹکتی ہوئی بیلوں کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر ٹیلے کی کوکھ سے اُبھر آیا ہے۔ اور گویا اس کی تخلیق میں کسی انسانی ہاتھ یا اس کے ذہن کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ یہ قلعہ اتنی دور سے دیکھنے پر بھی دل میں عجیب سحر آمیز کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

میرے پوچھنے پر میتا نے بتایا۔

بہت پُرانا قلعہ ہے صاحب۔ آدھے سے زیادہ گر چکا ہے۔ کہتے ہیں مغلوں کے زمانے میں پرماروں کے خاندان کی ایک شاخ کے سربراہ نے بھاگ کر اس وادی میں پناہ لی تھی۔ اور اس نے یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اب اس خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں ہے۔ انگریزوں کے وقت میں اس قلعے کی مرمت ہوتی رہتی تھی۔ کیوں کہ کئی من چلے انگریز شکار کے شوق میں ادھر آ نکلتے تھے۔ وہ لوگ اکثر قلعے میں آ کر ٹھہرا کرتے تھے۔ مگر آزادی کے بعد کسی کو اس کی مرمت کا خیال نہیں رہا۔ چند سالوں سے سرکار نے ادھر توجہ دی ہے۔ اور قلعے کا باقی حصہ گرنے سے بچ گیا ہے۔ اس کی دیکھ بھال اب کی جاتی ہے۔ مگر وہ پُرانی بات اب کہاں؟ جب گھر کا مالک ہی نہ رہے تو گھر کب تک چلے گا سرکار؟ ..... ہولے ہولے جو ہے وہ بھی ڈھے جائے گا۔ مگر گرتے گرتے بھی اس کو ابھی سو ڈیڑھ سو سال تو لگیں گے۔

دوپہر شباب پر تھی۔ ساری وادی میں دھوپ کا سنہرا رنگ چمک رہا تھا۔ وادی

ایک قدرتی مرغزار کی طرح امن اور سکون کے ماحول میں رچی بسی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے پہلی نظر ہی میں بیسرواہ کو پسند کر لیا۔ پھر میتا نے مرقبانوں اور قلیوں کو اشارہ کیا۔ اور ہمارا کارواں نیچے وادی کی جانب چل نکلا۔

سورج غروب ہوتے ہوتے ہم وادی میں داخل ہو گئے۔ دھان کا سبزہ آنکھوں میں کھبا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ درختوں کے کنج آدمیوں کی ٹولیوں کی طرح سر جوڑے کھڑے تھے اور اجنبی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے قلعے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں لکڑی کے ایک چھوٹے سے پُل پر چلنا پڑا۔ پُل پار کر کے ایک اُبھری ہوئی چٹان کی بڑی اوٹ کے پیچھے قلعے کا دروازہ تھا۔ اور جب ہم قلعے کے اندر گئے تو ایک دم باہر کی دنیا غائب ہو گئی۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا اور پُرانے مکانوں کی ایک عجیب سی بو، میرے نتھنوں میں آنے لگی۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ پھر چند ثانیوں کے بعد جب کھُلیں۔ تو معلوم ہوا کہ ہم قلعے کے اندر ایک بہت بڑے ہال میں کھڑے ہیں۔ جس کی دیواروں پر جگہ جگہ شیر۔ چیتے۔ بارہ سنگھے کے سر آویزاں ہیں۔ ہال کے مرکز میں لکڑی کا ایک بہت بڑا ستون کھڑا تھا اور جب چھت پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ پتھر کی چھت کے نیچے کسی مضبوط لکڑی کی ایک اور چوبی چھت کی تہ جمائی گئی ہے۔ جس کے دھندلے دھندلے جالوں کے اندر پرانی چوب کاری کے نقش معدوم سے نظر آتے ہیں۔

میں ابھی اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ سامنے سے ہال کی سیڑھیوں پر جو اوپر کی منزل کو جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایک آدمی ہاتھ میں لالٹین لئے نمودار ہوا۔ ہمیں دیکھ کر چند لمحوں کے لئے رکا۔

پھر متیا کو پہچان کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ یہ قلعے کا رکھوالا۔ باورچی، اردلی اور بیرا بھی کچھ تھا۔ عُمر پینتالیس برس کے قریب، پہلی نظر میں جب وہ مجھے زینے کے اوپر کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ تو مجھے اس کی گھنی، گہری بھنوؤں کے اندر اس کی آنکھیں بے چین دکھائی دیں اور شانے چوڑے اور سینہ مضبوط۔ کسی جنگلی گوریلے کی طرح۔ مگر جانے مجھ پر یہ تاثر کیوں ہوا۔ کیوں کہ جب وہ قریب آیا تو دوسری نظر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ اس کے شانے جُھکے ہوئے تھے۔ اس قدر جُھکے ہوئے کہ اس کے سینے کی مضبوطی کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اور اس کی مونچھوں کے دبے اور جُھکے ہوئے کونوں سے برسوں کی پُرانی عاجزی اور وفاداری اور جی حضوری کا اظہار ہوتا تھا۔ اور جب متیا نے اسے بتایا کہ میں کون ہوں اور یہاں کس کام سے آیا ہوں تو اس نے لالٹین فرش پر رکھ کر اور خود جُھک کر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مجھے بڑی عاجزی سے سلام کیا۔ اور میرے لئے غسل کا پانی گرم کرنے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد متیا نے مجھے بتایا۔ "شنکر ہے۔ بہت پُرانا بیرہ ہے۔ انگریزوں کے زمانے سے کام کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں بیس پچیس برس ہو گئے ہیں اسے یہاں کام کرتے ہوئے۔ اپنا کام خوب جانتا ہے۔ صاحب لوگ اس سے بہت خوش رہتے تھے پر تھوڑا لالچی ہے۔

"تھوڑا سا لالچی تو ہر ایک ہوتا ہے" میں نے کہا۔

پھر میں بات کا رُخ پلٹ کر متیا اور قلیوں اور مرقبانوں کا حساب کرنے لگا۔ حساب چُکانے کے بعد میں نے متیا کو پانچ سو روپیہ اور باقی سب کو دو دو سو روپیہ بخشش دی۔ اس کے بعد سب نے مجھے سلام کیا۔ اور مڑ کر قلعے کے باہر جانے کے لئے قدم بڑھانے لگے۔

اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ میں نے متیا کو آواز دی۔ "رات بڑھ رہی ہے اس وقت کہاں جاؤ گے۔ یہیں سو جاؤ۔ قلیوں اور مرقبانوں سے بھی کہہ دو۔"

وہ لوگ میری بات سن کر چونکے۔ ایک دوسرے کی طرف چپ چاپ دیکھنے لگے۔ متیا کچھ گھبرا کر کچھ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نہیں صاحب۔ اب ہم جائیں گے۔"

"مگر کہاں جاؤ گے اس وقت؟"

"نیچے گاؤں میں" ایک قلی بولا۔

"نیچے گاؤں میں جانے کے بجائے یہیں پڑ رہو۔ کھانا بھی ملے گا" میں نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ کھانے کے نام سے قلی لوگ تھوڑے ڈگمگائے مگر پھر گھبرا کر انھوں نے اور متیا نے اور مرقبانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ان سب لوگوں نے ایک بار ہی اکھڑے انکار میں سر ہلا دیا۔

"اب ہم کو چھٹی دو صاحب!" متیا بڑی عاجزی سے بولا۔

"اچھا جیسی تمھاری مرضی!" میں نے ان کا ارادہ دیکھ کر انھیں اجازت دے دی۔ وہ لوگ جلدی جلدی سلام صاحب۔ رام رام کہہ کر رخصت ہو گئے اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے قلعے کے ہال سے باہر نکل گئے۔ سب سے آخر میں متیا رہ گیا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر پھر جیسے دوسرے لمحے ہی میں اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اور مجھ سے کچھ مزید کہے بغیر وہ بھی رام رام کہہ کے چلا گیا۔ اور میں اس پُرانے قلعے کے سونے ہال میں اکیلا رہ گیا۔

اُن کے جانے کے بعد مجھے کچھ ایسا ضرور محسوس ہوا جیسے وہ لوگ جلد سے جلد اس قلعے سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب تھے۔ مگر ان کی گھبراہٹ اور بے تابی میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ تین دن تک ہم لوگوں کا اکٹھا ساتھ رہا تھا۔ اور اس وقت میں نے جوان لوگوں کو یہاں رک جانے کے لئے کہا تھا تو رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی سردی اور جنگل کی قربت کو مدِنظر رکھ کر ازراہِ انسانیت کہا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے انھیں ایک رات کے لئے قلعے میں رکھنے اور اپنی جیب سے کھانا کھلانے میں میرا کیا فائدہ تھا؟ مگر یہ پہاڑی لوگ کچھ عجیب سے ہوتے ہیں۔ خیر ٹھیک ہے چھوڑو۔

اتنا سوچ کر میں نے اپنے سامان کی طرف توجہ کی۔ سب سامان ٹھیک تھا۔ ادھر سے اطمینان کرنے کے بعد میں نے ہال میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ اتنے بڑے ہال میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے سامنے پتھر کی سیڑھیوں کا ایک زینہ تھا۔ جو گھوم کر شاید قلعے کی پہلی منزل کو جاتا تھا۔ میں ایک سیڑھی پر اوپر کی منزل کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا تاکہ نظر سامنے قلعے کے دروازے اور ہال میں پڑے ہوئے سامان پر رہے۔ مجھے اکیلے پن سے ڈر لگتا تھا اندھیرا اور سناٹا دونوں ایک دوسرے کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں پھر بھی

اس قلعے کے ماحول میں ضرور کوئی ایسی بات تھی۔ جو میرے دل میں بیزاری پیدا کر رہی تھی۔ ہر عمارت کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ عمارتیں انسانی ہاتھوں ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں مگر جب بن جاتی ہیں تو اپنی ایک الگ شخصیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جانداروں کی طرح۔ ان کا اپنا ایک منفرد تاثر ہوتا ہے جو دل و دماغ پر غیر شعوری طریقے سے اثر پیدا کرتا ہے۔ کبھی یہ تاثر اچھا مرتب ہوتا ہے۔ کبھی بُرا۔ پہلے تاثرات جو اس قلعے کے ماحول نے مرتب کئے۔ وہ ایک عجب طرح کی ناپسندیدگی اور بیزاری کے تھے۔ حالاں کہ میں نے ابھی قلعے کا ایک ہال ہی دیکھا تھا۔ اور اس کے دوسرے حصوں سے ہنوز ناواقف تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایسا کیوں ہے؟ مگر اس وقت میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ ممکن ہے یہ سب کچھ طویل سفر کی بیزار کُن پریشانی اور تھکن سے ہو۔ پہلی مرتبہ کسی اجنبی ماحول میں آنے سے پیدا ہوا ہو۔ میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اور اپنی نگاہیں سامنے کی دیوار پر جما دیں۔ جہاں کی تاریکی میں مجھے بارہ سنگھے کا ایک بڑا سر اپنے لمبے لمبے شاندار سینگ اٹھائے ہوئے مبہم اور تاریک آنکھیں کھولے مدھم مدھم سا نظر آ رہا تھا۔ یکایک جیسے اس بارہ سنگھے کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی اور وہ بڑی بڑی آنکھیں بتدریج روشن ہو کر شعلے کی طرح چمکنے لگیں۔ میں چونک گیا۔ اور غور سے اس بارہ سنگھے کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ان آنکھوں میں واقعی روشنی پیدا ہو رہی تھی اور وہ مردہ بے جان آنکھیں بتدریج سُرخ ہوتی جا رہی تھیں میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا جمے کا جما رہ گیا۔ آنکھیں بارہ سنگھے کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔ اتنے میں میرے پیچھے ایک آہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور میں گھبرا کر سیڑھیوں سے اُٹھ کر جو مُڑا تو ایک تیز ٹارچ کی شعاع نے میری آنکھوں کو چندھیا دیا۔ پھر میرے کانوں میں جیسے کسی گہرے کنویں میں ڈولتی ہوئی آواز آئی۔

"غسل کا پانی تیار ہے صاحب!"

یہ شنکر تھا جو زینے کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر ایک ٹارچ ہاتھ میں لئے

کھڑا تھا۔ چیخ بڑی مشکل سے میں نے اپنے حلق میں روک لی۔ شنکر میرے سامنے قلعے کے دروازے سے باہر گیا تھا۔ یہ میرے پیچھے کدھر سے آنکلا؟ میری حیرت بڑھ گئی۔ مگر میں نے اپنی حیرت اور گھبراہٹ پر قابو پالیا۔ اور کچھ کہے سُنے بغیر اوپر کی منزل کو جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر چڑھ کر گھوم کر نیچے حال میں دیکھا۔ تو گھپ اندھیرا تھا۔ بارہ سنگھے کی آنکھیں بے جان مردہ اور تاریکی میں کھوئی ہوئی تھیں۔ غالباً ٹارچ کی روشنی ان آنکھوں میں پڑی تھی جس سے معاً وہ آنکھیں مجھے چند لمحوں کے لئے زندہ اور سُرخ ہوتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا۔ اور میں خاموشی سے شنکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ زینے سے گزر کر ہم ایک چوبی غلام گردش میں سے گزرنے لگے۔ رات کے سناٹے میں لکڑی کے تختوں پر ہمارے قدموں کی آواز کی گونج بے حد گمبھیر۔ عجیب اور ہولناک معلوم ہو رہی تھی۔ پھر غلام گردش دائیں کو گھوم گئی۔ ہم بھی گھوم گئے۔ چلتے چلتے ایک کمرے کے قریب جا کر شنکر رکا۔ پٹ کھلا تھا۔ اور اندر سے لالٹین کی روشنی جھانک رہی تھی۔

لالٹین کی لرزتی ہوئی جھلملاتی ہوئی روشنی میں میں نے اس کمرے کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ چھت منقش لکڑی کی تھی۔ فرش بھی لکڑی کا تھا کمرے کی دیواروں پر نصف حصے تک مہاگنی کے چوبی تختے جڑے ہوئے تھے۔ جن کا گہرا بھورا پالش اب سیاہ ہو چلا تھا۔

ایک کونے میں مہاگنی کا بڑا پلنگ تھا۔ ایک کونے میں ڈریسنگ ٹیبل۔ دو آرام کرسیاں۔ ایک لمبی تپائی۔ ایک چھوٹی تپائی جس پر چینی کا ایک گل دان پڑا تھا۔ دوسری جانب ایک کھڑکی تھی۔ جس پر دبیز پردے گہرے بھورے رنگ کے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف سامان رکھنے کا چوبی ریک تھا۔ جنوبی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔

جو باتھ روم میں کھلتا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اسے مدت سے جھاڑا پونچھا نہیں گیا ہے۔

شنکر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ورنہ آپ کو سب ٹھیک ٹھاک ملتا۔ میں نے غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیا ہے۔ اور ٹھنڈا پانی بھی دو بالٹیاں کافی ہوں گی۔؟

کافی ہوں گی! میں نے کہا۔

صاحب غسل سے فارغ ہو لیں۔ جب تک میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ شنکر نے یہاں تک کہنے کے بعد کسی قدر پس و پیش کیا۔ پھر ایک تیز نگاہ مجھ پر ڈالی۔ جیسے میرا عندیہ معلوم کرنا چاہتا ہو۔ پھر بولا۔

"صاحب کیا ڈنر لیں گے۔ ویجی ٹیرین یا نان ویجی ٹیرین۔"

"میں سب کچھ کھاتا ہوں جو کچھ آسانی سے مل سکے کھلا دو۔"

"بہت اچھا سرکار۔" کہہ کر شنکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا سامان اٹھا کر لایا۔ پھر ڈنر تیار کرنے لگا۔ تو میں نے جلدی سے اپنا سامان کھولا۔ نہانے کا سامان نکالا پھر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے باتھ روم کی طرف چلا۔ نیا تولیہ، قمیض، پائجامہ باتھ روم کے اندر والے ہاتھ سٹینڈ پر رکھا اور ٹب میں بیٹھ کر نہانے لگا۔ دیوار پر میرے سامنے میرا لمبا بے ڈھنگا تاریک سایہ بھی بڑے مضحکہ خیز طریقے سے نہاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور میری ہر حرکت کی نقل کرتا ہوا معلوم ہوا تھا۔ جونہی میں جگ اٹھاتا وہ بھی اٹھاتا۔ میں ہاتھ رکھ دیتا۔ وہ بھی رکھ دیتا۔ میں سر پر پانی ڈالتا۔ وہ بھی ڈالتا۔ میں جسم کو ربڑ کے جھانویں سے ملنے لگتا۔ وہ بھی ملنے لگتا۔ میں اس کی حرکت دیکھنے کے لئے معاً رک گیا۔ وہ بھی رک گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً کوئی ایسی حرکت کر کے پیش قدمی کر جاؤں جو یہ سایہ اس لمحے نہ کر سکے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ میری ذرا سی حرکت پر وہ بھی فوراً ہلنے لگتا تھا۔ جیسے وہ بھی ہر پیش بندی

کے لئے تیار ہو۔ آدمی چاند کو فتح کر سکتا ہے۔ مگر اپنے سائے کو شکست نہیں دے سکتا۔

نہا دھو کر بالوں میں کنگھی کر کے۔ شب خوابی کے کپڑے پہن کر میں ڈنر کے لئے تیار ہو گیا۔ غسل کرنے سے بدن تو ہلکا ہو گیا تھا، مگر آنکھیں غنودگی کے بار سے بھاری ہونے لگی تھیں۔ پپوٹوں پر نیند کا بوجھ پڑنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ جلدی سے کھانا کھا کے بستر میں گھس کے سو جاؤں۔ تین دن کے سفر کی کلفت تھی۔

ایک کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوشش کرنا تو صرف پہاڑ دکھائی دیتے ذرا اپنے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیتا تو حروف آنکھوں کے آگے شریر بچوں کی طرح ناچنے لگتے۔ اور ان کے بے جا اچھل کود میں معانی و مطالب کی پوری تفہیم غائب ہو جاتی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد جب شنکر "کھانا تیار ہے صاحب" کہنے کے لئے آیا۔ تو میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے کا کمرہ شکر ہے زیادہ دور نہ تھا۔ بائیں طرف ایک کمرہ بند تھا۔ اس کے اگلے کمرے میں تھا۔

مہاگنی کی چھت سے پرانی وضع کا ایک پرتگیزی لیمپ لٹک رہا تھا۔ گول مضبوط میز تھی۔ جس پر بیک وقت آٹھ آدمی مل کر کھانا کھا سکتے تھے۔ اس وقت صرف ایک آدمی کا کھانا لگایا گیا تھا۔ غدہ ٹماٹو سوپ تھا۔ چکن کا قورمہ۔ پراٹھے۔ دال۔ اور چاول۔ ڈٹ کے کھایا۔ پہلے لگتا تھا کہ نیند زیادہ ہے اب معلوم ہوا کہ بھوک زیادہ ہے۔ اور جب کھانا کھا چکا تو نیند کا غلبہ ایک دم گہرا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کھانے کی میز سے اُٹھتے ہوئے شنکر کی باورچی گیری کی تعریف کی۔ اسے ایک روپیہ بخشش میں دیا پھر اس سے جلدی سے اپنے کمرے کے پلنگ پر بستر بچھانے کو کہا۔ اس وقت تک ہم لوگ کھانا کھانے کی میز

سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آ چکے تھے۔

"صاحب یہاں سوئیں گے؟" شنکر نے حیرت سے مجھ سے کہا۔

"ہاں!"

"اس کمرے میں؟"

"ہاں اس کمرے میں۔ یا کسی اور کمرے میں۔ اگر وہ اس سے بہتر ہو۔"

"سب سے اچھا کمرہ تو یہی ہے صاحب! مگر ــــ" وہ کہتا کہتا رک گیا۔

"مگر کیا؟"

"اس قلعے میں رات کو کوئی سوتا نہیں ہے۔"

"کیا تم رات کو یہاں نہیں سوتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"نہیں جناب! میں تو نیچے کے ڈاک بنگلے میں سوتا ہوں۔"

"تو آج رات یہاں سو جاؤ۔"

"نہیں جناب!۔" وہ گھبرا کر بولا۔ "میں تو وہیں سوؤں گا اور میری گذارش یہ ہے کہ حضور بھی رات کو وہیں قیام فرمائیں۔ صبح پھر ادھر تشریف لا سکتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھنے پر زور سے اصرار کیا۔

"صاحب!" شنکر پس و پیش کرتے ہوئے بولا۔ "ادھر اس قلعے میں رات کو نو دس سال سے کوئی نہیں سوتا ہے۔"

"کیوں نہیں سوتا ہے؟" میں نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"صاحب! لوگ کہتے ہیں اس قلعے میں بھوت رہتے ہیں۔"

"بھوت!"

شنکر نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تب تو میں ضرور یہاں سوؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں اسے جواب دیا۔

مجھے بھوتوں سے کوئی ڈر نہیں لگتا ہے۔"

شنکر نے ہاتھ جوڑ کر بڑے پریشان اور ہراساں لہجے میں کہا۔ "صاحب ضد نہ کریں۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ نیچے نئے ڈاک بنگلے میں چل کر سوئیں۔ یہ میری عرض ہے۔ آج سے سات سال پہلے ایک انجینئر صاحب نے اس طرح کی ضد کی تھی۔ بس دو تین دن تک اس کمرے میں رہ پائے تھے۔ چوتھے دن اسی کمرے میں بستر پر ان کی لاش پائی گئی۔"

"بھوتوں نے مار ڈالا؟"

"ایسا ہم پہاڑی لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر تیراہ کا ڈاکٹر بولا ہارٹ فیل سے مر گیا۔"

"ڈاکٹر نے ٹھیک کہا ہوگا۔"

"اب میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ حضور۔ رات کو یہاں نہ سوئیں۔"

"اب تو یہیں سوئیں گے شنکر۔" میں نے اس سے کہا۔ "آج تک اپنی زندگی میں کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اسی بہانے یہ شوق بھی پورا ہو جائے گا۔ تم جاؤ صبح آجانا۔"

جب میں کسی طرح نہیں مانا۔ تو شنکر مجھے قلعے کے دروازے کے اندر کا قفل اور چابی دے گیا۔ لالٹین لے کر میں اسے قلعے کے باہر تک چھوڑنے گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں نے اسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ بڑا دروازہ اندر سے بند کیا۔ دروازہ بند کر کے لکڑی کے دو بھاری صلیب نما ڈنڈے آر پار آہنی ہکوں میں پھنسا کر قفل لگا یا۔ چابی جیب میں ڈالی واپس آکر بارہ سنگھے کے سر کو لالٹین اُٹھا کر غور سے دیکھا۔ اور پھر اپنی حماقت پر ہنس کر وہاں سے چل دیا۔

زینہ چڑھ کے غلام گردش میں پہنچا۔ غلام گردش سے گھوم کے اپنے کمرہ میں پہنچا۔ ساتھ والے کمرے کو غور سے دیکھا۔ جس پر باہر سے ایک مضبوط آہنی قفل لگا تھا۔ پھر واپس

اپنے کمرے میں۔ کمرہ اندر سے دیکھ بھال کے بند کیا۔ دونوں چٹخنیاں چڑھائیں۔ کنڈی لگائی۔ کنڈی میں قفل لگایا۔ پھر اطمینان کر کے باتھ روم میں گیا۔ باتھ روم کا ایک دروازہ میرے کمرے میں تو دوسرا دروازہ بغل کے کمرے میں کھلتا تھا جو باہر سے مقفل تھا۔ غالباً یہ باتھ روم دونوں کمروں کے رہنے والوں کے استعمال کے لئے بنایا گیا تھا۔ باتھ روم کا دوسرا دروازہ اُدھر سے بند تھا۔ دوسرے کمرے کی طرف سے جو باہر سے مقفل تھا۔ ایک کھڑکی مغربی جانب تھی۔ وہ بھی بند تھی۔ اوپر نیچے دونوں چٹخنیاں بند تھیں۔ میں اچھی طرح سے اطمینان کر کے باتھ روم کے باہر آگیا۔ باتھ روم کا دروازہ میرے کمرے کی جانب سے بند نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اسے بھیڑ دیا اور پھر اپنے پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا۔ نیند جانے کہاں چلی گئی تھی۔ بار بار کسی نامعلوم خوف سے بانہوں کے بال کھڑے ہو جاتے اور جسم میں ایک جھرجھری سی آجاتی۔ بھوت سے ملنے کا اشتیاق بھی تھا اور ڈر بھی۔ بہت دیر تک پڑھتا رہا۔ بیچ بیچ میں نیند زور مارتی تو اچانک چونک کر ہوشیار ہو جاتا۔ کوئی دو بجے تک نیند سے لڑتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں وہیں بستر پر اکڑوں کروٹ لے کر لیٹے لیٹے کتاب پر سر رکھ کر سو گیا۔

یکایک گھپ اندھیرے میں آنکھ کھلی۔ لیمپ کی بتی جل کر بجھ چکی تھی۔ غالباً تیل ختم ہو گیا تھا۔ دروازے کے باہر آہٹ ہو رہی تھی۔ کوئی دبے پاؤں میرے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ پھر جیسے کوئی اُچھل کر غلام گردش کے چوبی فرش پر رُک گیا۔ بہت دیر تک سناٹا رہا۔ بہت طویل عرصہ تک ایسا محسوس ہوا جیسے اب تک جو کچھ میں نے سُنا۔ عالم خواب میں سُنا تھا۔ یا کانوں کا واہمہ تھا۔

پھر میں سو جانے کو تھا کہ اتنے میں آہستہ سے کوئی میرے دروازے کے باہر جیسے میرے دروازے کو بڑی احتیاط سے ہاتھ لگا کر ٹٹولنے لگا۔ سرسر کھرکھر کی آواز آرہی تھی۔

میں اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ تکیئے کے نیچے ڈال کر میں نے ٹارچ نکالی۔ دوسرے ہاتھ میں قریب کی دیوار سے لگی ہوئی تھری ناٹ تھری کو پکڑا۔ اور بے آواز قدموں سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ بالکل بے آواز حرکت سے میں نے اپنے کمرے کا قفل اور اس کی کُنڈی کھولی۔ چٹخنیاں بھی اسی طرح نیچے کیں۔ اس میں کئی منٹ لگ گئے۔ پھر میں نے ایک طرف ہو کر دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ اور ٹارچ کی روشنی باہر ڈالی۔

کمرے کے باہر دروازے کی چوکھٹ سے لگی دو بلیاں بیٹھی مجھے گھور رہی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی دونوں اُچھل کر بھاگیں۔ اور غلام گردش کے چوبی فرش پر اُچھلتے ہوئے غائب ہوگئیں۔

جان میں جان آئی۔ اور سانس میں سانس آئی۔ میں نے مُسکرا کر دروازہ پھر سے بند کیا۔ اب کے قفل نہیں لگایا۔ صرف کنڈی چڑھا دی اور واپس اپنے پلنگ پر آکر بے خبر سو گیا۔ صبح دیر تک بے سدھ سوتا رہا جب جاگا تو گھڑی دوسرے دن کے دس بجا رہی تھی۔ اور کوئی باہر سے میرا دروازہ زور، زور سے پیٹ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ باہر شنکر ہراساں اور خائف کئی پہاڑی باشندوں کو لئے کھڑا تھا۔ وہ لوگ غالباً سب مجھے مُردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ اور اب میری لاش کو اُٹھانے آئے تھے۔

مجھے زندہ اور مُسکراتے دیکھ کر وہ سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

شنکر کا چہرہ فق تھا۔ جیسے اسے مجھے زندہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی ہو۔

"صاحب ہم نے تو سمجھا۔ آپ کو بھوت نے مار ڈالا۔ دیر تک قلعے کا دروازہ پیٹا۔ جب آپ نے نہیں کھولا۔ تو ہیں گاؤں کے لوگوں کو بُلا کے لایا۔" شنکر نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر قلعے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ تو تم لوگ اندر کیسے آئے؟" میں نے پوچھا۔

"نوکروں کے راستے سے!" شنکر نے بتایا۔ "نوکروں کا راستہ الگ ہے اس کی کنجی میرے پاس رہتی ہے۔"

"تم دیکھ سکتے ہو میں زندہ ہوں۔"

"رات کو بھوت نہیں آیا؟" شنکر نے کسی قدر بے چینی اور تعجب سے پُوچھا۔

"بھوت تو نہیں البتہ دو بلیاں ضرور آئی تھیں!" میں نے مُسکرا کر کہا۔ "سب ٹھیک ہے شنکر۔ میں تین دن کے سفر کا تھکا ہوا تھا۔ اس لئے دیر تک سوتا رہا۔ اب تم بھوتوں کی طرف دھیان نہ دو۔ اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ ناشتہ لگاؤ۔"

"ابھی حاضر کرتا ہوں۔" شنکر نے محجوب ہوتے ہوئے کہا۔ پھر گاؤں کے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو دوسروں سے کس قدر ممتاز نظر آتا تھا۔ "یہ روی داس ہے

گاؤں کے نمبردار ہیں۔"

روی داس نے میری طرف دیکھ کر بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ بولا

"صاحب پولیس مین ہیں؟"

"نہیں تو!" میں نے کہا۔ "تمھیں کس نے بتایا؟"

"کسی نے نہیں جناب۔" روی داس نے شنکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "شنکر نے بتایا آپ کے پاس نھری ناٹ تھری کی بندوق ہے۔ اس سے خیال ہوا۔"

"اس کا تو لائسنس میرے پاس ہے۔ میں لائسنس یافتہ شکاری ہوں۔"

"صاحب جنگل میں شکار کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہاں تو بیدرواہ کے غاروں کے اندر جو تصویریں پائی جاتی ہیں۔ ان کا رنگ روغن ٹھیک کرنے اور ان کی نقلیں لینے کے لئے آیا ہوں۔"

نمبردار کو اطمینان سا ہوا۔ بولا۔ "صاحب لمبا ٹھہریں گے؟"

"ہاں۔ جب تک کام مکمل نہ ہو۔"

"صاحب اطمینان سے اپنا کام کریں۔" روی داس نے سر جھکا کے کہا کسی قسم کی ضرورت ہو تو غلام حاضر ہے۔"

اس کا لب و لہجہ بالکل ایسا تھا جیسے انگریزوں کے زمانے میں نمبرداروں کا ہوا کرتا تھا۔

"فی الحال تو مجھے بیدرواہ کے غار دیکھنا ہوں گے۔ تم دکھا سکتے ہو؟"

"میں حاضر ہوں۔"

"اس وقت تو نہیں۔ کوئی تین گھنٹے کے بعد آنا۔" میں نے نمبردار سے کہا

نمبردار اپنے آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ اور تین گھنٹے کے بعد لوٹنے کا وعدہ کر گیا۔

ناشتے کے بعد میں نے شنکر کو ساتھ لے کر قلعے کا باقی حصہ دیکھا۔ میرے کمرے سے ملحق جو بند کمرہ تھا۔ وہ انواع و اقسام کے فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ شنکر نے مجھے بتایا۔ اس لئے میں نے اسے کھلوا کے نہیں دیکھا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ اس کے آگے قلعے کا زنانہ تھا جو ڈھے چکا ہے۔ پھر واپس آ کر دوسری غلام گردش میں سے مختلف کمروں کو دیکھا۔ ادھر تین کمرے تھے اور ایک باتھ روم بالکل میرے کمرے کی طرح۔ مگر بے حد ناصاف اور گندے اور میلے۔ اور مٹی اور جالوں سے بھرے ہوئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے برسہا برس سے کوئی ان کمروں میں نہیں رہا ہے۔ غلام گردش کے ایک جانب یہ تین کمرے تھے۔ دوسری جانب کی آدھی دیوار پتھروں کی تھیں۔ اور پتھروں کی اس دیوار کے اوپر غلام گردش کے ایک سرے سے دوسرے تک رنگین کانچ کی کھڑکیاں تھیں جن میں سبز، نیلے، پیلے اور سرخ رنگ کے کانچ لگے تھے۔ جب کھڑکیوں سے دھوپ چھن کر آتی تھی تو غلام گردش کے اندر رنگین شطرنجیاں جھلملانے لگتیں۔ میں نے ایک کھڑکی کھول کر دیکھا۔ اور نیچے جو نظر ڈالی تو ننگی اور خطرناک چٹانوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیا۔ جو تقریباً عموماً نیچے کی گہری کھائی تک جاتا تھا۔ جہاں بیدرواہ کے دونوں نالے آ کے مل جاتے تھے۔ پرماروں نے یہ قلعہ بہت سوچ سمجھ کر تعمیر کیا تھا۔ ادھر سے کسی غنیم کا حملہ کرنا ناممکن تھا اور قلعے کے چاروں اطراف کو دونوں ندیوں نے گھیر لیا تھا۔ اور ایک قدرتی خندق بنا ڈالی تھی۔ یہ دونوں ندیاں قلعے کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے کر آگے چند کھیتوں سے پرے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے گرد گھوم کر پھر الگ ہو جاتی تھیں۔ اس ٹیلے پر درختوں کا ایک گھنا کنج تھا اور اس کنج میں سے مندر پیتل کا کلس دھوپ میں چمک رہا تھا۔

یہ بھوانی کا مندر ہے۔ شنکر نے کہا۔ جب پرمار راجہ نے یہ قلعہ بنوایا تھا اس نے قریب میں یہ مندر بھی بنوایا تھا۔ بہت پرانا مندر ہے صاحب۔ پر اب بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔

میں نے دل میں سوچا۔ پہلے غار دیکھ لوں۔ پھر کسی دن اس کو بھی دیکھیں گے۔

شنکر نے کھڑکی بند کر دی۔ اور مجھے آگے لے چلا۔ جہاں غلام گردش ختم ہوتی تھی۔ وہاں پر صرف تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جو غالباً قلعے کے دوسرے حصّے کو جاتی تھیں۔ جواب گر چکا تھا۔ یہاں پر پھر چٹانوں پر مٹی چونے، گارے کا ڈھیر پڑا پڑا اس قدر پرانا ہو گیا تھا کہ اس پر جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور لمبی لمبی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔

یہاں سے ہم واپس چلے۔ غلام گردش پار کر کے مجھے شنکر اس زینے پر لایا جو اُتر کر نیچے قلعے کے ہال میں جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس ہال کے اوپر بھی ایک زینہ جا رہا ہے۔

اوپر کیا ہے؟ میں نے شنکر سے پوچھا۔

گول کمرہ ہے۔

چلو دکھاؤ۔

شنکر زینہ چڑھنے لگا۔ چڑھتے چڑھتے ہم ایک بند دروازے کے باہر پہنچے۔ شنکر نے چابی لگا کر قفل کھولا۔ اندر چلے۔ اندر پھر اُونچی سیڑھیوں کا ایک زینہ نظر آیا۔ اسے چڑھ کر اوپر پہنچے۔ تو پھر ایک بند دروازہ نظر آیا۔ شنکر نے اسے کھولا۔ تو ہم لوگ گول کمرے میں تھے۔

گول کمرہ اتنا ہی بڑا تھا۔ جتنا نیچے کا ہال۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی شکل

بیضوی تھی اور دیواروں پر جانوروں کے سر کے بجائے پرمار خاندان کے راجاؤں اور رانیوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور پرانی تلواریں اور ڈھالیں اور پیش قبض، فرش لکڑی کا تھا۔ جس پر ایک عمدہ گول ایرانی قالین بچھا ہوا تھا جو اسی قدر گندہ اور میلا ہو گیا تھا کہ اس کے سارے نقش و نگار مٹیالے پڑ گئے تھے۔

شنکر نے بڑے فخر سے بتایا۔ "لاٹ صاحب جب یہاں شکار کو آتا تھا۔ تو اس گول کمرے میں ڈانس کرتا تھا۔"

"اور جب راجہ لوگ یہاں ہوتے ہوں گے تو مجرا ہوتا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو صاحب مجھے معلوم نہیں۔" شنکر کہنے لگا۔

اس گول کمرے کے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں چار دروازے تھے۔ شنکر نے چاروں دروازے کھولے۔ اور مجھے باہر لے گیا۔ گول کمرے کے باہر چاروں طرف کوئی تیس فٹ چوڑا فرش تھا۔ جس کے آگے کوئی پانچ فٹ چوڑی مضبوط اور جید دیوار کا حاشیہ تھا۔ جو اس قدر مضبوط تھا کہ اب تک اس میں سے ایک پتھر بھی نہ ہلا تھا۔ اس دیوار میں جگہ جگہ توپیں نصب تھیں۔ میں نے گنیں کل آٹھ توپیں تھیں۔ مگر چاروں طرف اس خوبی سے لگائی گئیں تھیں کہ قلعے کے چاروں طرف کا علاقہ ان کی زد میں تھا۔ یہاں سے بیدرواہ کی وادی کا منظر پورا نظر آتا تھا۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک یہ چھوٹی وادی میری نظروں کے سامنے کھلی تھی۔ اور چاروں طرف اُونچے اُونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا۔ جن کی چوٹیاں برف پوش تھیں۔ میں دیر تک اس خوبصورت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کام کا خیال کر کے بادل ناخواستہ اس جگہ سے لوٹا۔ گول کمرے سے نیچے اُتر کر واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ شنکر سے کہا کہ وہ دوپہر کا کھانا ابھی تیار کر کے میرے ساتھ کر دے۔ میں غسل کے بعد بیدرواہ

کے غاروں میں جاؤں گا۔

غسل سے فارغ ہو کر میں نے کپڑے بدلے ایک خط گھر کے لئے لکھا۔ خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔ دوسرا خط اپنے محکمہ کے نام لکھا۔ اتنے میں روی داس آگیا۔ میں نے دونوں خط اسے دیئے اور اسے تاکید کی کہ آج ہی ایک آدمی تیراہ روانہ کر دے۔ جوان خطوں کو پوسٹ کر کے آئے۔ روی داس نے اس وقت گاؤں کے ایک چوکیدار بشمبر کو تیراہ روانہ کر دیا۔ اور میرے لنچ کا ٹفن کیریر اور دوسرا ضروری سامان اُٹھا کر میرے ساتھ بیدرواہ کے غاروں کی جانب روانہ ہوا۔ لکڑی کا پُل پار کر کے ہم ایک پتھریلی ڈھلوان اتر کر نیچے وادی میں پہنچ گئے۔ اور دھان کے کھیتوں کے بیچوں بیچ جاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی چکنی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے بیدرواہ کے اس پہاڑ پر پہنچے جہاں غاروں کے تاریک مُنہ کھُلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

دھان کے کھیتوں کو پار کر کے ہمیں کئی کسانوں کے چھوٹے چھوٹے گھر ملے۔ یہاں سے گزر کر ہم اُوپر ایک سطح مرتفع پر پہنچ گئے۔ یہاں پر پھلدار درختوں کا ایک چھوٹا سا باغ ہمیں نظر آیا۔ جس کے گرد لکڑی کا ایک جنگلہ تھا۔ لکڑی کے جنگلہ کے کنارے چلتے چلتے پھلدار درختوں کے سائے میں چھپا ہوا ہمیں ایک گیٹ نظر آیا۔ جو باغ کے اندر جاتا تھا۔ اور جس کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی کانچ کا سامنے کا حصہ نظر آرہا تھا۔ کانچ کے پورٹیکو سے لیکر گیٹ تک ایک چھوٹا سا ڈھلان راستہ تھا۔ جس پر سیاہ رنگ کی بجری کوٹ کوٹ کر بچھائی گئی تھی۔ گیٹ پر دائیں طرف لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی ٹیڑھی ٹنگی تھی۔ جس کی ایک کیل نکل چکی تھی۔ دوسری کیل سے لٹکی ہوئی تختی ہولے ہولے ہوا سے جھول رہی تھی۔ میں نے گردن خمیدہ کر کے تختی پر لکھا ہوا نام پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔

"رچرڈز کاٹیج"

گیٹ کے دونوں طرف گلابی رنگ کے بوگن ویلیا کے پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک عورت سر جھکائے ان میں پانی دے رہی تھی۔ میں نے اسے پہلی نظر میں نہیں دیکھا۔ میں نمبردار سے باتیں کئے چلا جا رہا تھا کہ وہ عورت شاید ہم دونوں کی آوازیں سُن کر چونکی۔ اور پانی دینے کا نلکی دار ڈول ہاتھ میں لئے گردن اُٹھا کر سیدھی کھڑی ہوگئی اور حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔ وہ سفید شلوار اور ایک باریک سفید دوپٹہ اوڑھے جس پر چاندی کی چمپا بھرت کا کام تھا۔ کھڑی تھی۔ دوپٹے کے ہالے میں اس کا گول گلابی چہرہ حیرت سے مجھے تکتا نظر آیا۔ وہ مجھے اور میں اسے ہم دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہے تھے۔ اس کے لباس چال ڈھال اور بالوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی شہری عورت ہے۔ اس جنگلی اور دور افتادہ علاقے میں وہ بھی ایک شہری کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر اچنبھے میں ڈوب گئی۔

"صاحب بیدرواہ کے غاروں کی تصویریں اُتارنے آئے ہیں!" نمبردار روی داس نے اپنے سر کی بھاری مجرکم پگڑی ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا "آپ محمود صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں۔ جن کا یہ بنگلہ ہے۔" میں نے ذرا ٹھٹک کر لکھنوی انداز میں آداب کیا۔ اس عورت نے ذرا سا مُسکرا کر جواب دیا اور گیٹ کھول کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ میں اس کے ساتھ باتیں کرتا کرتا پورٹیکو کی طرف بڑھنے لگا۔ گفتگو کے دوران میں اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام نسیمہ ہے۔ اس کے خاوند کا نام محمود ہے۔ وہ دونوں بارہ سال سے اس کانچ میں مقیم ہیں۔ اس کا خاوند ایک امیر آدمی ہے۔ مگر عزلت پسند ہے۔ اسے تنہائی عزیز ہے۔ اسی لئے انھوں نے اس دور افتادہ تہذیب و تمدن سے الگ تھلگ جگہ کا انتخاب کیا۔ میں نے کچھ کہا تو نہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھ سکا کہ کسی امیر آدمی کے لئے اس ویرانے میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ آدمی امیر ہو تو شہر میں بھی اپنے لئے ایک ویرانہ تعمیر کر سکتا ہے۔ جس کی تنہائی میں کوئی حارج نہ ہو سکے۔

پورٹیکو میں بچھی ہوئی ایک آرام کرسی پر آرام دہ گدیلوں میں دھنسا ہوا ایک دُبلا پتلا لانبا آدمی دراز تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر ایک رومال ڈال رکھا تھا اور قرائن سے لگتا تھا جیسے سو رہا ہے۔

مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ اپنے قریب قدموں کی چاپ اور گفتگو کی آواز سن کر وہ آدمی چونکا۔ رومال اس کے چہرے سے اتر کر اس کی گود میں جا گرا۔ میں اسے دیکھ کر حیرت سے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس مرد کے دونوں بازو اور چہرہ جگہ جگہ سے بری طرح جلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پلاسٹک سرجری میں اس کے چہرے کا حلیہ ٹھیک طرح سے ٹھیک کرنے میں ناکامی رہی ہے۔ پپوٹوں پر بال نہیں تھے۔ سیاہ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ جا چکی تھی۔ وہ اس قدر کریہہ المنظر تھا کہ میں اپنے دلی تاثرات چھپا نہ سکا۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ لئے۔ کرب کا ایک گہرا رنگ اس کے چہرے پر آیا۔ اور اس نے بڑے کرخت اور بیزار کن لہجے میں اپنی بیوی سے پوچھا۔

"یہ کون ہے؟ اور تم اسے یہاں کیوں لائی ہو؟"

نسیمہ سہم گئی۔ پھر چند ثانیے چپ رہنے کے بعد اس نے میرا تعارف کرایا۔ اتنے عرصے میں میں اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا تفصیلی تعارف کرایا۔ میرے لہجے میں بیحد عجز تھا اس سے غالباً وہ متاثر ہوا ہوگا۔ کیوں کہ اس کا لہجہ بھی اب بدل گیا۔ اور اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کی پیش کش کی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ نسیمہ میرے قریب دیوار سے لگے ہوئے ایک دیوان پر بیٹھ گئی۔

"اب تم سمجھ سکتے ہو۔" محمود نے مجھ سے کہا۔ "میں کیوں اس اجاڑ جگہ میں آ کے رہنے لگا ہوں۔ میرا چہرہ میرے گھر کی آتشزدگی میں اتنا جل گیا تھا کہ اچھے سے اچھے پلاسٹک سرجن بھی مایوس ہو گئے انھوں نے ایک چہرہ تو بنا دیا ہے۔" وہ مسکرا کر کہنے لگا "اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ۔ یہ منہ ہے۔ یہ کان ہے۔ یہ آنکھ ہے۔ یہ ناک ہے۔ مگر سب کچھ

ہونے پر بھی کچھ نہیں ہے۔ سب جل گیا۔" اس کی مسکراہٹ بڑی بھیانک تھی۔ میں نے بدبداکر نیم مہمل جملوں میں اس سے ہمدردی ظاہر کی۔

"یہ بے کار کی باتیں ہیں۔" محمود غصّے سے بولا۔ "اس چہرے سے کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ میں جب خود ہی اس چہرے سے نفرت کرتا ہوں۔ تم کیسے اس سے ہمدردی کر سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

نسیمہ نے خاموشی سے میری طرف ایسی مجبور نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو۔ "میرے شوہر کو معاف کر دو۔ اگر تم اس کی ذہنی حالت کو سمجھ سکتے ہو۔"

میں نے پھر اس کی باتوں کو اَن سُنی کر کے اس سے انتہائی شیریں لہجہ میں ہمدردی جتائی۔ شاید میرے ہمدردی جتانے میں انسانی خلوص بھی شامل رہا ہوگا کہ وہ پھر نرم پڑ گیا۔ نسیمہ کی طرف ایک ٹیڑھی میڑھی بھدّی اُنگلی اُٹھا کر بولا۔

"یہ سب نسیمہ کی شرارت ہے۔ اسی کی وجہ سے تم بیدرواہ بھیجے گئے ہو۔ تم جانتے ہو کیا؟" محمود نے مجھ سے پوچھا۔

میں حیران ہو کر نسیمہ کی طرف دیکھنے لگا۔ جواب اپنے خاوند کا غصّہ ڈھلتا دیکھ کر مُسکرانے لگی تھی۔ بولی۔

"مجھے بھی مصوری کا شوق ہے۔ زیادہ نہیں... یونہی سا۔ میں نے ہی آثارِ قدیمہ کے محکمے کو لکھا۔ بیدرواہ کے غاروں کے بارے میں۔ اور اس کی تصویروں کی چند نقلیں بھی بھیجی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان تصویروں کے رنگ ماند پڑتے جا رہے ہیں ان کا کچھ ہونا چاہیے۔"

"کئی برس میں نے اسے اجازت نہیں دی۔" محمود کے لہجے میں پھر سختی آ گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی آئے اور اگر کوئی آنا بھی تھا تو میں کسی سے ملتا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے نسیمہ کو اجازت نہیں دی۔ مگر اس سال اس نے تصویروں کی درگت دیکھ کر میری اجازت کے بغیر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے افسر کو یہاں آنے کی دعوت دی۔ اور مجھے چوری

چھپے اسے یہ غار دکھائے۔ اور اب تمھیں ان لوگوں نے یہاں بھیج دیا ہے۔ اور اب تم غالباً ایک لمبی مدت تک یہاں رہو گے اور میری بیوی سے عشق کرو گے۔"

"محمود!" نسیم غصّے سے بولی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" نسیم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے بہت افسوس ہے ..... واقعی مجھے معلوم نہیں تھا۔ ورنہ میں ادھر کا رُخ تک نہ کرتا۔ میں جاتا ہوں مسٹر محمود۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ اب میں کبھی ادھر کا رُخ نہیں کروں گا۔"

"بیٹھو ..... بیٹھو ..... میری باتوں کا بُرا نہ مانو۔"

محمود یک لخت شرمندہ سا ہونے لگا۔

"میں ایسا ہی ہوں۔ جب تم مجھے زیادہ جان جاؤ گے۔ تو میری باتوں کو سُن کر ان سُنی کر دو گے۔ مجھے ہڈی کا کینسر بھی ہے۔ زیادہ دن نہیں ٹکوں گا۔ تمھیں مجھے معاف کر دینا چاہیئے۔ نسیم اکیلی ہے۔ دس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔ میرے ساتھ۔ اس کی قُربانی عظیم ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں، مگر ....."

یکا یک وہ رونے لگا۔ چُپ چاپ ..... خاموشی سے .....

میں چپ چاپ خاموشی سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ کہتا بھی کیا؟ بالکل کسی ایسے اجنبی کی طرح محسوس کر رہا تھا جو کسی ڈرامے کے کلائمکس کے عین درمیان سٹیج پر آدھمکے میں کرسی سے اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر پاؤں گویا زمین میں گڑے تھے۔

نسیم تمھارے ساتھ جائے گی۔ یہ سب غار اس کے دیکھے ہوئے ہیں۔ وہ تمھیں ایک ایک تصویر کے بارے میں بتا سکتی ہے۔"

میں نے پس و پیش کیا۔ مگر محمود نہ مانا۔ اس نے نسیم کو میرے ساتھ روانہ کر دیا۔

گیٹ سے نکل کر ہولے ہولے ہم خاموشی سے چلتے رہے۔ پہاڑ پر جانے کے لئے نسیم نے بسنتی رنگ کا بلاؤز پہن لیا تھا اور اودے رنگ کی جینیز، بالوں کو کس کر پیچھے ایک گچھے کی طرح ایک بڑے کلپ میں باندھ لیا تھا۔ جس سے اس کی گردن کا خم اور بھی تیکھا ہو گیا تھا۔ ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی تھی۔ ہمارے پیچھے پیچھے ہری داس کچھ فاصلے پر سامان اُٹھائے اور جھولا لٹکائے آرہا تھا۔ "مجھے یہ وادی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ "جی چاہتا ہے یہیں رہ جاؤں۔"

"دو دن میں اُکتا جاؤ گے۔ رسیاں تڑا کر بھاگو گے۔ مجھے اس وادی سے نفرت ہے۔"

"شاید تمھیں شہر چاہیئے اور اس کے ہنگامے۔ ڈانس اور کلب۔ اور کپڑوں کے نت نئے فیشن۔ اور جگمگاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چکنی چمکدار باتیں۔ جیسی کہ مہذب لوگوں میں ہوتی ہیں۔"

"ہاں!"

"پھر تم یہاں کیوں آگئیں؟"

"وجہ کیوں پوچھتے ہو۔ وجہ تو تمھیں سب معلوم ہو چکی ہے۔"

وہ اپنی چھڑی سے راستے کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ہٹاتی جا رہی تھی۔

"تم نے اصرار کیا ہوتا۔ شہر میں رہ جاتے دونوں!"

"محمود اپنا چہرہ دُنیا کو نہیں دکھا سکتا۔ تم نہیں جانتے اس آتش زدگی سے پہلے وہ کتنا حسین اور خوبصورت تھا۔"

"آگ کیسے لگی؟ کس نے لگائی؟"

"فسادوں کے زمانے میں لگی۔ سن سینتالیس میں۔ غنڈوں نے لگائی۔ تم بھی تو ہندو ہو۔"

"میرا نام موتی لال ناگر ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "جو مجھ سے قریب ہو جاتے ہیں وہ مجھے لالی کہتے ہیں۔ لال سے لالی۔"

"آپ کا میرے قریب آنے کا کوئی امکان نہیں ناگر جی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "مجھے ہندوؤں سے نفرت ہے۔" اس نے ایک دم جھلّا کے کہا۔

"تھینک یو"!

وہ ایک دم ہنس پڑی۔

"یہ کیا بات ہوئی! میں نے پوچھا۔

"I am very capricious !" " وہ انگریزی میں بولی۔

سبھی عورتیں capricious ہوتی ہیں۔ یعنی تلون مزاج۔ گھڑی میں تولہ۔ گھڑی میں ماشہ۔ تم دوسری عورتوں سے الگ نہیں ہو۔ کیا تمھاری اور محمود کی محبت کی شادی ہے؟"

"نہیں!" بس اس نے اتنا کہا۔ پھر دیر تک چپ رہی۔ آخر کار ایک چھوٹے سے پتھر کو اپنی چھڑی سے زور سے مار کر بولی۔

"ایک لڑکا تھا اکرم۔ شاید مجھے اس سے محبت تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

وہ سر ہلا کر بولی "نہیں۔ نہیں۔ مجھے اس سے نہیں۔ اسے مجھ سے محبت تھی۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اور اس کی چاہت مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ شاید میں اس کے ساتھ بہت خوش رہتی۔ مگر وہ غریب تھا اس کے ماں باپ غریب تھے اور اس کا خاندان غریب تھا۔ میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی تھی۔ مگر میں اسے صاف صاف بتا بھی نہیں سکتی تھی۔"

"تمھیں اس پر رحم آتا تھا؟"

"رحم نہیں۔ مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ جن نظروں سے وہ مجھے دیکھتا تھا۔ جس طرح میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتا تھا۔ جیسی جیسی وہ بے وقوفی کی باتیں میرے ساتھ کرتا تھا۔ وہ بڑی دلکش ہوتی تھیں۔ اس کے خواب بڑے عجیب تھے۔ میں رکشا میں بیٹھ کر اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ کہیں پیدل چل کے پکنک منا رہی ہوں کسی پہاڑی گاؤں میں ہم جا کے کسی چھوٹے سے جھونپڑے میں رہتے ہیں۔ میں گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے لئے ندی سے پانی لا رہی ہوں۔ اس کا کھانا پکا رہی ہوں۔ رات کو ایک ٹوٹی ہوئی غیر متوازن کھٹیا پر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر اس کا ماتھا تھپک تھپک کر سلا رہی ہوں۔"

"یہ خواب عجیب کیوں کر ہیں؟"

"کیوں کہ یہ نچلی سطح کے خواب ہیں۔ میں رکشے میں کبھی بیٹھی نہیں۔ پیدل چل کے کبھی پکنک نہیں منائی۔ کبھی کسی جھونپڑے میں نہیں رہی۔ نہ کبھی ندی سے پانی لائی۔ نہ کھانا پکایا نہ ٹوٹی کھٹیا پر سوئی۔ عجیب آدمی تھا۔ مجھے کہاں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ اس کی ایسی عاشقانہ باتیں سن کر مجھے بڑا ڈر لگتا تھا۔ کیا واقعی وہ سنجیدہ تھا؟"

"بات دراصل یہ ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ "وہ بے چارہ اپنی غربت کو

ایک رومانوی غلاف میں لپیٹ کر تمھیں پیش کر رہا تھا۔"

"جی ہاں!" وہ بڑے کڑوے مُڑ میں بولی۔ "آج کل کی لڑکیاں ایسی احمق نہیں ہیں کہ ایسی عاشقانہ باتوں میں آ جائیں۔ وہ اُوپر اُوپر کا شاعرانہ عشق دور سے بڑا اچھا لگتا ہے۔ جب میں آئی۔ ٹی۔ کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھی تو ایک صاحب تھے، سوز فتح پوری۔ وہ مجھ پر عاشق ہو گئے تھے۔ ہر ماہ ایک نئی غزل رسالہ ماہتاب میں میرے لئے چھپواتے تھے۔ ہر غزل کے کسی نہ کسی شعر میں میرا نام ہوتا تھا۔ اور اوپر بھی بریکٹ میں لکھا ہوتا تھا "ن" کے نام ہر ماہ وہ یہ رسالہ میرے نام بھیجتے تھے۔ پہلی بار جب رسالہ مجھے ملا اور وہ غزل میں نے پڑھی تو دھک سے رہ گئی۔ کتنی خوبصورت اور مرصع غزل تھی۔ سوز و گداز سے بھرپور۔ اور الفاظ کے ترنم، جیسے موسیقی پگھل کے بہ رہی ہو۔ چھ ماہ تک ان کی غزلیں رسالہ ماہتاب میں میرے لئے چھپتی رہیں۔ اور میرا اپنا دل اپنے نادیدہ عاشق کے لئے بے چین رہنے لگا۔ جی چاہتا تھا کیسے اسے دیکھوں۔ کہاں سے اس کا پتہ پاؤں؟ اور جا کے اس کے سینے سے لگ جاؤں۔ پہلے سوچا رسالے کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر سوز فتح پوری صاحب کا پتہ معلوم کروں۔ مگر شرم مانع آئی۔ خوش قسمتی سے ساتویں شمارے میں رسالے کے اندر جہاں غزل چھپی تھی۔ وہیں دو صفحوں کے درمیان مجھے سوز کا خط مل گیا۔ سوز نے اس خط میں اپنا سارا سوز دروں پھونک دیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی وہ خط پڑھ کر آتشِ شوق میں تڑپنے لگی۔ فوراً اسے جواب لکھا۔ اسے سات دن کے بعد بنارسی باغ میں ملنے کو کہا۔ اور شام کو پانچ بجے اس جگہ انتظار کرنے کو کہا۔ جہاں کھرنی کے درختوں کے جھنڈ کے اندر ایک بنچ رکھی ہے میں ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔

ساتویں دن بُدھ تھا۔ وہ دن مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔ کیسے سج سنور کر دھڑکتے ہوئے دل کو لے کر میں اپنے ابا کی گاڑی خود ڈرائیو کر کے میں بنارسی باغ سارناتھ

چھ بجے کے قریب پہنچی۔ اگر پانچ بجے پہنچ جاتی تو بے چارہ کس قدر مایوس ہوتا۔ انتظار عاشق کا پیدائشی حق ہے۔ اگر آپ اپنے عاشق کو انتظار نہیں کرنے دیتیں تو وہ سخت مایوس ہو گا۔ ممکن ہے عشق کرنا ہی چھوڑ دے۔ اس لئے ہر معشوق کے لئے وقت دے کر دیر سے پہنچنا بے حد ضروری ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ باہر کے کھلے ہوئے ماحول سے اس کی فطری بشاشت اُبھر آئی تھی۔ اور اب وہ رچرڈز کالج کا علالت زدہ۔ ماحول بھول کر عورتوں کے فطری انداز میں بے حد رواں دواں لہجے میں باتیں کئے جا رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا؟ کیا ــــ؟"

اس نے مجھے جلدی سے روک کر کہا۔ "تم سُنو تو..... میں نے جب مولسری کے کنج کے کنارے اپنی کار روکی اور پٹ کھولا تو سوز فتح پوری مجھے بنچ سے اُٹھتا نظر آیا۔ عجب کالی بھجنگ مُورت پائی تھی اس نے گال اندر کو دھنسے ہوئے آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی۔ ماتھا پیچھے کو ڈھلکتا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے بال اور لمبی لمبی قلمیں۔ جیسے پُرانے زمانے کے ہالی وڈ ایکٹروں کے ہوتی تھیں۔ ایک پھولا ہوا سفید اچکن کا کُرتا اور پاپلین کا بڑے پائچوں والا پاجامہ پہنے عجب طرح کا اسکرکرو (SCARE CROW) نظر آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے چار ماہ کے بعد حجامت کرا کے بال کٹوا کے آج ہی پہلی بار حمام سے نہا کر نکلا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر ہی دھک سے رہ گئی۔ سارے ہوائی قلعے دھڑام سے میرے قدموں میں آ گرے۔ میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ ہی سوز فتح پوری ہیں؟"

"جواب میں اس نے کتھئی رنگ کی پوری بتیسی کھول دی اور جھک کر آداب کرنے لگا۔ میں نے کہا "میں ابھی آتی ہوں" اور پیشتر اس کے کہ وہ آگے بڑھتا۔ میں نے کار کا دروازہ زور سے بند کیا۔ اور گاڑی سٹارٹ کر کے یہ جا..... وہ جا....."

پھر کبھی ملنے کا موقع نہیں ہوا اس سے۔ کم بخت کسی چنگی خانے میں محرر تھا اور عشق

کرنے چلا تھا مجھ سے ..... "

میں نے کہا۔ "اپنے ہاں ایک کہاوت ہے۔ پریم نہ دیکھے جات کجات۔ پریم نہ دیکھے کایا۔ مایا۔ پریم تو ہے دل کی چھایا۔ ..... "

"یہ سب باتیں قصے کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ آدمی کو عشق اپنی کلاس ہی میں رہ کر کرنا چاہیے۔"

"پہلی شرط آپ کی یہ تھی کہ عشق اپنے مذہب میں رہ کر کرنا چاہیے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ اپنی کلاس میں کرنا چاہیے اگر اور بھی کوئی شرطیں ہوں تو وہ بھی بتا دیجئے۔"

وہ ہنسی۔ مگر اب اس کی ہنسی میں اس کا ہانپنا بھی شامل ہو گیا تھا کیونکہ چڑھائی تقریباً عمودی تھی۔ اور مجھے کئی جگہ تو جھک کر اور جھاڑیاں پکڑ کر یا چٹانوں کی اُبھری ہوئی نوکوں کا سہارا لے کر اُوپر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ اس لئے گفتگو خود بخود بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں پہلا غار آ گیا۔ اور ہم تینوں اس کے اندر چلے گئے۔

دو غار سامنے کی گھاٹی میں تھے۔ تین پہاڑی کے دوسری طرف پیچھے کی گھاٹی میں۔ یہ پانچوں غار چٹانوں کو کاٹ کر نہیں بنائے گئے تھے قدرتی غار تھے۔ جن میں پرمار راجپوتوں نے شروع شروع میں پناہ لی تھی۔ بعد میں اپنے رہنے کے لئے انھوں نے ان غاروں کو کاٹ کاٹ کر بڑا کر لیا۔ انھیں انسانی ضروریات سے سجایا۔ ان کی دیواروں پر نقش و نگار اُبھارے۔ بعد میں جب سنبھلنے کا موقع ملا تو باہر نکل کر وادی میں اپنا قلعہ تعمیر کیا۔

ہر غار میں چٹانوں سے ترشا ہوا ایک مرکزی ستون تھا۔ جس پر شو اور بھوانی کی مورتیاں کھُدی ہوئی تھیں۔ پانچویں غار میں ایک چھوٹا سا شوالہ غار کے اندر موجود تھا۔ اس شوالے کی چٹانی چھت میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ ان دراڑوں سے کہیں اُوپر پہاڑ کی چھاتی میں بہنے والے جھرنے کا پانی رس رس کر نیچے اترتا تھا۔ اور شو لنگم کو دھوتا ہوا غار سے باہر ایک چھوٹے سے نالے کی صورت میں بہتا تھا۔

پانچویں غار تک آتے آتے بھوک چمک اُٹھی تھی۔ یہاں پانی نہیں تھا اس لئے ہم غار کے اندر بہنے والے جھرنے کے کنارے بیٹھ گئے۔ اور ٹفن کیریئر کھول کر کھانا

کھانے لگے۔ ایک ہی روٹی سے نوالہ توڑنے میں اور افراد کے درمیان انسانی ہمدردی کا رشتہ بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ روٹی جیسی سادہ چیز روح کی دوری اور مذہبی مغائرت کو آن واحد میں مٹا ڈالتی ہے کھانا کھاتے کھاتے مجھے یہ چار نوالوں کی روٹی بڑی ہی پُراسرار شے معلوم ہوئی۔

"ان غاروں کی مصوری کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟" نسیمہ نے مجھ سے پوچھا۔

"تمھارا کیا خیال ہے؟" میں نے پلٹ کر سوال کیا۔

"مجھے پسند نہیں ہیں۔ سبھی انسانی چہرے ایک سے ہیں۔ سبھی درخت ایک سے ہیں۔ آدمی، ماحول، فطرت اپنے تنوع رنگا رنگی نظر نہیں آتی۔ وادی کی خوب صورتی اور گھلے پن کی ایک بھی تصویر ان میں نہیں ہے۔ انسان اور فطرت دونوں کو علامتوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہر کانگڑہ سکول کی مصوری میں ہوتا ہے۔ ان تصویروں میں اندھیرا بہت ہے۔ برہ کا موضوع غالب ہے ان تصویروں کو دیکھ کر دل میں مایوسی کا تاثر زیادہ ہوتا ہے۔" نسیمہ اتنا کہہ کر ایک دم چُپ ہوگئی۔

"شاید یہ تصویریں انسان کی دھرتی سے جُدائی کی یاد دلاتی ہیں۔ جب پرماراجپوتوں کو اپنا گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اور اس اجنبی وادی میں پناہ لینی پڑی۔ اس لئے مایوسی اور اندھیرے کا رنگ غالب ہے۔ مجھے تو علامتیں پسند ہیں۔ اس لئے کہ انسانوں کے چہروں کی ظاہری ساخت کے اختلاف کے باوجود وہ اندر سے ایک سے ہیں۔ فطرت کی اندرونی حقیقت کو بھی اسی طرح علامتی انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ یہاں تک کہ انسان ماحول اور فطرت کی ایک ہی اندرونی کرب کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ مغربی مصوری کے بہترین شاہکار باہر کی حقیقت کی اہمیت بتاتے ہیں ان غاروں کی مصوری کا رُخ اندر کی طرف ہے۔ جیسے خود انسان کی روح ایک غار ہو۔ جس میں مصور اپنے موقلم سے راستہ ٹٹول رہا ہو۔"

"ان تصویروں کو دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا ہے۔" نسیمہ کے چہرے پر بیزاری کے

آثار نمایاں ہونے لگے۔ "ان تصویروں کو دیکھ کر مسکرانا بھی مشکل ہے یہ تصویریں فطرت کی رعنائی۔ انسان کی امید، عورت اور اس کے شباب کی مسرت کو جھٹلاتی ہیں۔"

"مسرت ہے کہاں؟ مسرت تو ایک چھلاوہ ہے۔ کرب انسان کی ابدی قسمت ہے۔ اس کی مستقل تقدیر ہے۔ تم خود اپنے دل کے زخم دیکھو۔"

"مگر ان زخموں کے باوجود دل کی کسی گہرائی میں چٹانوں کے اندر دبا ہوا مسرت کا کوئی چشمہ بہتا ہے اور اس شوالے کی دڑاروں سے رس رس کر بہنے والے پانی کی طرح باہر آنے کو بیتاب ہے۔ میں جوان ہوں، اور خوشی میرے بدن کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ کر بہنے کو بے چین ہے۔ تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے؟"..... نسیمہ نے بڑی شدت سے کہا کہ "روح کا بھی ایک جسم ہوتا ہے۔"

"مجھے یہ معلوم ہے۔ مگر میرے لئے اس بات میں زیادہ اہمیت ہے کہ ہر جسم کی ایک روح ہوتی ہے۔" میں نے نسیمہ سے کہا...

"تم آفاقی اور مابعد الطبیعاتی باتیں کرتے ہو۔ تم پرلے درجے کے احمق ہو اس دُنیا کے باہر کچھ نہیں ہے۔ اور میں تو اسی دُنیا کی ہوں اور اسی دُنیا کی خوشیاں مجھے چاہئے۔ اور وہ بھی جھولی بھر کر۔" نسیمہ بولی۔

"پھر تم نے اکرم سے اپنی جھولی کیوں نہیں بھرلی۔" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ اس کا ہاتھ خالی تھا اس وقت جب اس نے مجھ سے محبت کی۔ مجھے وہ بہت پسند تھا اور آج مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں نے زندگی میں پہلی بار اس سے محبت کی ہوگی مگر اس وقت مجھے معلوم نہ تھا۔ اس وقت میرے ماں باپ نے میرے سامنے محمود رکھا۔ محمود جوان خوبصورت اور ایک امیر و کبیر جاگیردار کا بیٹا تھا۔ وہ میرے سارے خواب پورے کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے خواب تو پورے کر لئے مگر اکرم مجھے یاد آتا رہا۔

تنہائیوں کے سونے لمحوں میں میری روح میں چٹکیاں لیتا رہا۔ کبھی کلی کی طرح مہکتا تھا، کبھی کانٹے کی طرح زخم دیتا تھا۔ مگر میرے اردگرد خوشیاں اتنی تھیں کہ میں نے اکرم کی یاد کو ان گنت حریری تہوں کے اندر چھپا دیا تھا۔ "تاکہ بھولے سے بھی میری نظر اس پر نہ پڑے۔"

"آدمی جس کا گناہگار ہوتا ہے۔ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

"گناہگار تو میں محمود کی بھی ہوں کہ مصیبت میں اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہوں۔!"

"کیوں دس سال سے تم اس زندگی کی ساری دلکشیوں اور رعنائیوں سے دور اجاڑ ویرانے میں پڑی ہو۔ کاہے کے لئے؟ اپنے شوہر کا ساتھ دینے کے لئے ناں!"

"دل سے تو ساتھ نہیں ہوں۔ من کو مار کے یہاں آئی ہوں۔ مگر من مرتا تو نہیں ہے۔ پھر وہ قربانی کس کام کی جو ہر لحظہ ایک کانٹے کی طرح کھٹکے۔ جس قربانی کی دیوار کو ہر لحظہ توڑ کر زندگی کی جواں بانہوں میں آنے کو جی چاہے۔ وہ قربانی، قربانی نہیں رہتی، زنداں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ دس سال سے میں یہ قید کاٹ رہی ہوں۔ آخر میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟" نسیمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"پھر تم محمود کو چھوڑ کے چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

وہ ایک طویل آہ بھر کر بولی۔ "اب کیسے چھوڑ کر جاؤں؟ اب جس کے لئے دس سال سے سب کچھ اپنا تباہ کر لیا ہے۔ اب اسے چھوڑ کر جانے سے بھی کیا فائدہ؟"

"اکرم کہاں ہے؟"

"ہوگا کہیں۔" نسیمہ نے بڑی تلخی سے کہا۔ "اب سے تین سال پہلے جب محمود کو لیکا یک کینسر ہوا تھا اور میں اسے بمبئی لے گئی تھی۔ ٹاٹا انسی ٹیوٹ میں علاج کرانے کے لئے۔ ان دنوں بمبئی میں اک بار ملا تھا۔ انجینیئر بن گیا ہے۔ کسی فرم میں پچیس سو تنخواہ لیتا ہے۔"

"خوش تھا؟" میں نے پوچھا۔

"خوش کیوں نہ ہوگا!" وہ بولی۔

"شادی کر لی ہوگی اس نے؟" میں نے پوچھا۔

نسیمہ بولی۔ "میں پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مگر شادی کیوں نہیں کی ہوگی۔ اس نے ایسے لڑکے کو کون کنوارا رہنے دیتا ہے۔ اب تو اس کے بچے بھی ہوں گے!"

نسیمہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کی آواز میں ایسا رشک تھا جیسے وہ بچے اس کے کیوں نہ ہوئے۔ اکرم سے اور ایسا غصہ کہ اکرم کو کسی دوسری عورت سے بچے پیدا کرنے کا حق ہی کیا تھا؟ عورت کی مالکانہ اور غاصبانہ حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کے لئے محبت کوئی دھندلی دھندلی چاندنی نہیں ہے۔ اس کے لئے محبت ایک ایسا محدود متشکل جذبہ ہے۔ جو اس کے ہاتھوں کی گرفت میں آ سکتا ہے۔ اور جسے وہ جب چاہے اٹھا کر اپنے پرس میں ڈال سکتی ہے۔ محبت کی مبہم۔ ماورائی۔ پُراسرار اور غیر محدود کیفیت سے وہ بہت گھبراتی ہے۔ اسی لئے میں کسی ایسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا، جو اس دنیا کی ہو۔ مجھے تو بس وہ گلابی چرن مکمل پسند ہیں جو مجھے کبھی کبھی خیالوں کے افق پر ناچتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد روی داس نے بتایا۔ "صاحب ابھی دو غار اور باقی ہیں۔ جو بیگم صاحب نے بھی نہیں دیکھے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" اکرم شوق اور خوشی سے چیخ کر بولی۔

"وہ ادھر ہیں۔ اس گھاٹی کے پیچھے۔" روی داس نے ایک دور افتادہ جنگلوں سے گھری ہوئی گھاٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

نسیمہ نے دیکھ کر کہا۔ "پورا دن لگ جائے گا وہاں تک پہنچنے میں۔"

میں نے اس گھاٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھنے میں تو وہ جگہ بہت نزدیک نظر آتی ہے۔"

"بدھو!" نسیمہ اک دم بے تکلفی سے بول پڑی۔ "پہاڑی جگہیں دور سے دیکھنے میں بہت نزدیک نظر آتی ہیں۔ مگر جتنے قریب جاؤ اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہیں۔"

"عورت کی طرح ناں؟" میں نے نسیمہ سے پوچھا۔
وہ ہنس پڑی۔ مگر اس کا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔
کچھ عرصہ چُپ رہنے کے بعد اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی۔
"میں نے تمھیں سب جگہیں بتا دی ہیں۔ اب میں جاتی ہوں۔"
"بیٹھو۔ شام اکٹھے چلیں گے!"
"کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا جی نہیں چاہتا ہے۔ مدت کے بعد تو اپنے وطن کے ایک آدمی کی صُورت دیکھنے کو ملی ہے۔ ..... مگر ....."
اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔
"اچھا جاؤ۔ روی داس تمھیں گھر تک پہنچا آئے گا۔"
"پھر ملیں گے" کہہ کر نسیمہ مجھ سے رخصت ہوئی۔ روی داس کو میں نے ہدایت کی کہ وہ بیگم صاحب کو گھر تک پہنچا کے لوٹ آئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنا سامان درست کیا۔ غار کی دیواروں کا چکر لگایا اور تصویروں کو غور سے دیکھا۔ آخر اس تصویر کے سامنے اپنے اینزل رکھ دیا۔ جوگا گڑھ کے مشہور مصور خوشی رام کی بنائی ہوئی تھی۔ جس میں ایک پہاڑی راجکماری آدھی رات کے وقت اپنے عاشق سے ملنے کے لئے برف وہاراں کے طوفان میں جا رہی ہے۔ چند منٹوں میں میرے سامنے نہ یہ دُنیا تھی نہ یہ غار تھا۔ میرے چاروں طرف طوفان گرج رہا تھا۔ اور میں اس راجکماری کو بالکل اپنے قریب سے چراغ رُخ زیبا لیکر اپنے عاشق کو ڈھونڈتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ابھی سورج غروب نہ ہوا تھا کہ روی داس نے آکر مجھ سے کہا۔ "صاحب واپس چلئے۔ ورنہ قلعے تک پہنچتے پہنچتے بالکل اندھیرا ہو جائے گا۔"

میں نے اپنا سامان بند کر کے روی داس کے حوالے کیا۔ اور غار سے نکل کر ہم لوگ تیز تیز قدموں سے بید رواہ کے غاروں کی گھاٹی اترنے لگے۔ رچرڈز کالج تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہوگیا۔

رچرڈز کالج کے دروازہ پر نسیمہ کھڑی ملی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ اور چہرہ لال تھا۔ اور ٹھوڑی پر ایک آبلہ ابھر آیا تھا۔ میں نے روی داس کو آگے جانے کی ہدایت کی اور خود چوبی گیٹ کے اس طرف کھڑا ہوگیا۔ دوسری طرف نسیمہ کھڑی تھی۔ اس نے آنکھیں جھکاتے ہوئے سسکیاں لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔
"انھوں نے منع کر دیا ہے۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔"
میں نے پوچھا۔
"یہ تمھاری ٹھوڑی کو کیا ہوا ہے؟"
"اپنے سگار کی جلتی ہوئی راکھ انھوں نے مجھ پر پھینک دی۔" وہ رک رک کر بولی۔
پھر میرا بھی سر جھک گیا۔ بہت دیر تک میں چپ رہا۔ آخر میں نے کہا۔
"وہ بیمار ہیں انھیں معاف کر دو!"
"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔" وہ بڑی شدت سے بولی۔ "کیوں کہ تمھیں کسی کال کوٹھری میں بند کر کے دس سال تک کسی کی تیمارداری پر مجبور ہونا نہیں پڑا ہے۔ مگر مجھے نفرت ہے۔ نفرت ہے... نفرت ہے....." وہ شدید تلخی سے بولی۔ پھر پلٹ کر تیز تیز قدموں سے واپس چلی گئی۔

راستے بھر میں نسیمہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ کبھی تو مجھے اس سے ہمدردی ہو جاتی کبھی نفرت۔ کتنی خود غرض عورت ہے۔ اس کا خاوند مر رہا ہے۔ مگر وہ صرف اپنی خوشی کے بارے

میں سوچتی ہے۔ مگر نہیں۔ اتنی بری عورت بھی نہیں ہے۔ دس سال سے اس جنگل بیابان میں پڑی ہے۔ کوئی دوسری ہوتی تو اب تک اکتا کر بھاگ گئی ہوتی آخر ایک عورت کی زندگی اور جوانی کے بھی کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال کرتا ہوں تو نسیمہ بڑی بہادر عورت دکھائی دیتی ہے۔ کاش وہ اپنی قربانی کی خود بھی قدر کر سکتی۔ مگر وہ جو نفرت کرتی ہے اپنے آپ سے اپنے شوہر سے اپنے ماحول سے۔ مگر حکم لگانا آسان نہیں ہے۔ ذرا میں اپنے آپ کو دس سال تک، دس ماہ تک، دس ہفتہ تک اس ماحول میں رکھ کر کے دیکھوں۔ شاید مجھے بھی نسیمہ کی طرح نفرت ہو جائے گی۔

راستے بھر دل انھیں متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ جب قلعے کے قریب پہنچا تو شفق ڈوب چکی تھی۔ ایک گہرے سرمئی غبار نے ساری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جب لکڑی کے پل پر پہنچے تو شنکر ایک لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا ملا۔ مجھے دیکھ کر کچھ کہے بغیر پلٹ کر پل پر راستہ دکھاتے ہوئے واپس چلنے لگا۔

جب قلعے کے اندر ہال میں پہنچے تو یکایک ایسا لگا جیسے کالی اندھیری رات آگئی۔ قلعے کے مہیب پر اسرار ماحول نے مجھے چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جیسے یکایک باہر کی دُنیا سے میرا رشتہ کٹ گیا۔ میں صدیوں پیچھے کسی پرانے اجنبی ماحول میں سانس لینے لگا۔

روی داس کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ تو میں نہانے کے لئے چلا گیا۔ نہا کر کپڑے بدل کر نکلا تو شنکر نے بتایا کہ کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا کر واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ تو کچھ دیر کے بعد شنکر اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے پاس آیا۔ آج اس کے چہرے پر کل سے بھی زیادہ پریشانی تھی کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں پھر اس بحث میں الجھوں۔ میں اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے ذرا مضبوط لہجے میں اس سے کہا۔

"چابیاں یہیں چھوڑ جاؤ۔ صبح آجانا۔"

شنکر دیر تک وہیں کمرے کے اندر میرے سامنے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار تھیں۔ یکایک وہ بول پڑا۔

"میں نے صاحب کے لئے نیچے ڈاک بنگلے میں کمرہ ٹھیک کر دیا ہے۔ صاحب وہاں چل کر سوئیں۔"

"نہیں!" میں نے اس سے بڑی سختی سے کہا۔ "میں یہیں اسی کمرے میں اسی قلعے کے اندر سوؤں گا اور جب تک بیدرواہ میں رہوں گا یہیں سوؤں گا۔ چلے جاؤ!"

میں نے اس سختی سے ایسے ڈانٹ کے کہا کہ شنکر چند لمحوں کے لئے سہم گیا۔ پھر اس نے آہستہ سے مایوسی سے سر ہلایا اور گردن جھکا کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

کل کی طرح بڑے ہال کا دروازہ میں نے خود بند کیا۔ تمام کمروں کے بند دروازوں کو اچھی طرح سے ہلا کے دیکھا۔ دونوں غلام گردشوں کی بند کھڑکیوں کا غور سے جائزہ لیا۔ پھر اپنے کمرے میں محصور ہو کے آبیٹھا۔ اب دیکھتے ہیں بھوت کدھر سے آتا ہے۔ میں نے اپنی نھری ناٹ نھری پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

دیر تک بستر پر نیم دراز حالت میں لیٹا پڑھتا رہا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ اس قلعے کا ماحول واقعی نیند کے لئے سازگار نہیں ہے۔ اس قدر تھکا ہوا ہوں۔ پھر بھی نیند نہیں آتی ہے۔ قلعے کا ہولناک سناٹا دھیرے دھیرے میرے حواس پر مسلط ہونے لگا۔ ایک دیو زاد پیکر کی موہوم صورت اختیار کر کے مجھے ڈرانے لگا ایسا لگا جیسے قلعہ کی ہر دیوار میں آنکھیں ہیں اور وہ چاروں طرف سے مجھے گھور رہی ہیں۔ انھیں میری موجودگی گوارا نہیں ہے۔ اس لئے انتہائی نفرت اور غصے سے کھولتی ہوئی مجھے گھور رہی ہیں۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے دل سے اس خیال کو دور کر دینا چاہا۔ اور اپنی پوری توجہ کتاب پر مرکوز کر دی۔ مگر ہر حروف آپس میں گڈمڈ ہو کر عجب عجب خوفناک

شکلیں اختیار کرنے لگے ۔ میں نے کتاب بند کر دی ۔ لیمپ کی بتی نیچے کر دی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا ۔ کمرے کی نیم تاریک دیواریں پُراسرار لبادے اوڑھے ہوئے یکایک میرے بستر کے قریب آ گئیں اور میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا ۔ لیمپ کی بتی اُونچی کی، اور پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا ۔

بے کار کا مطالعہ تھا ۔ کوئی حرف پلّے نہ پڑتا تھا ۔ کوئی فقرہ سمجھ میں نہ آتا تھا مگر میں اس میکانکی انداز میں اپنے ذہن کو تھکانے کے لئے پڑھتا گیا ۔ حتیٰ کہ میرے پپوٹے ذہن کی تکلیف سے بوجھل ہو کر جلنے لگے ۔ پھر ایک عجیب سہمی سکڑی نیم غنودگی کی باہنوں سے لپٹ کر میں نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا ۔ کتاب اپنے سینے پر پھر مجھے معلوم نہیں کب میں سو گیا ۔

دُنیا میں تاریکی تھی ۔ اور میں اپنے بستر پر لیٹا تھا ۔ اور میرے چاروں طرف ایک عجب سی نیم تاریک دھند چھائی ہوئی تھی ۔ اور یہ میرے چاروں طرف تھی اور میں اس سے بچ کر کہیں نہ جا سکتا تھا ۔ اب کوئی آسمان نہ تھا ۔ کوئی زمین نہ تھی ۔ میں خوابوں کی دھندلی دھندلی فضاؤں میں لپٹا تھا اور میرے چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی ۔ یہ دھند چاروں طرف تاریک تھی ۔ اور بیچ میں نیم تاریک نیم روشن اور مدھم مدھم ہالے سے جھلملا رہے تھے ۔ یہ دھند میرے اردگرد چاروں طرف سانسیں لے رہی تھی ۔ لمبی لمبی آہوں اور کراہوں سے مشابہ سانسیں ۔ پھر اس دھند کے ہالے میں مجھے دو گلابی چرن کمل چلتے ہوئے نظر آئے ۔ وہ دھیرے دھیرے میرے بستر کے قریب بڑھ رہے تھے ۔ میں نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا ۔ دو گلابی گلابی نازک خطوط کی طرح ترشے ہوئے پاؤں ۔ میں نے ان پاؤں سے اوپر دیکھا ۔ اوپر پھر دھند ہی دُھند اُڑتی ہوئی نظر آئی ۔ مگر میرے نیم خوابیدہ ذہن میں رچے اس سفید کپڑے میں جیسے ایک سفید ساڑی کے خم واضح ہونے لگے ۔ یہ ساری سرسراتی ہوئی ۔ دُھند میں ملتی گھلتی ہوئی میری طرف چل رہی تھی ۔ میں نے اور اُوپر دیکھا ۔ دُھندلے دھندلے آنچل میں لپٹا ہوا ایک سپید چہرہ مجھے نظر آیا ۔ اس چہرے پر سُرخی کی ایک لکیر نہ تھی ۔ یہ چہرہ برف سے ترشہ ہوا تھا یا سنگ مرمر سے، ناک ستواں،

غنچہ دہن آنکھیں جھکی ہوئی اور بند ماتھے پر موت کی شبنمی تنویر ۔ وہ سفید ساری میں ملبوس پیکر میرے قریب آتا گیا ۔ میرے قریب آتا گیا ۔ وہ چہرہ سوگوار اور اداس ۔ باریک نازک اور اجلا ۔ صبح کے اٹھتے ہوئے اندھیروں میں چمیلی کا مہکتا ہوا پیلا پھول ۔ وہ چہرہ گویا میرے سر پر جھکا ہوا تھا ۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ یکا یک دو آنکھیں مجھ پر کھلیں اور میں ان کی سیاہ اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا ۔ مجھے معلوم نہ رہا کہ میں کہاں ہوں ۔ یہ خواب ہے کہ حقیقت کہ دونوں کا امتزاج کہ وہم کہ صدیوں کی چاہت اور ۔ پھر اس غنچہ دہن کے ہونٹ وا ہوئے اور ایک گہری سسکی کے ساتھ دھیمی دھیمی سانسوں میں اٹکے ہوئے لہجہ میں مجھ سے کہنے لگی ۔ "آہ میرا دم گھٹ رہا ہے ۔ مجھے بچا لو ۔ مجھے بچا لو"

میں نے اس چہرے کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھائے ۔ یکایک وہ چہرہ سمندر کی سطح پر پانی کے عکس کی طرح تھرتھرانے لگا ۔ دھند کی لہروں میں، معدوم ہونے لگا ۔ ہوتا گیا ۔ گم ہو گیا ۔ اب میرے چاروں طرف دُھند ہی دھند تھی اور دھند کے گہرے مرغولے سپید سپید بادلوں کی طرح میرے چاروں طرف اُڑ رہے تھے ۔

یکایک میں چونک کر جاگا ۔ کمرے میں کوئی نہ تھا ۔ لیمپ کی روشنی مدھم ہو کر جھلملانے لگی تھی ۔ دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناچ رہے تھے ۔ اور کتاب میرے سینے پر رکھی ہوئی تھی ۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ اور ایسا لگتا تھا، جیسے ابھی ابھی کوئی اس کمرے سے باہر گیا ہے ۔

مگر نہیں یہ میرا وہم تھا ۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا ۔ غسل خانہ خالی تھا ۔ غسل خانے کی کھڑکی بھی بند تھی اور غسل خانے کا دروازہ جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا وہ بند تھا ۔ آنے جانے کی اور کوئی راہ نہ تھی ۔ یقیناً کوئی یہاں نہ آیا تھا ضرور میں نے خواب دیکھا تھا ۔

مگر پھر بھی جانے کیوں ذہن پر یہی احساس غالب تھا کہ ابھی ابھی کوئی یہاں سے ہو کر گیا ہے

٭

میں پھر رات بھر سو نہیں سکا۔ کتاب گود میں لئے پڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا اور دوسری طرف جا کر غلام گردش کی ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ ہال کا بڑا دروازہ نیچے جا کر کھول دیا۔ اور پھر ڈریسنگ ٹیبل پر جا کر شیو کرنے لگا۔ مگر ذہن میں ابھی تک وہ سپید ستا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا اور گھوم گھوم کر آنکھوں میں آجاتا۔ اور کسی طرح ذہن سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔ پھر شنکر چائے لے کر آگیا۔ اس نے کچھ کہا تو نہیں مگر اس کی پھٹی پھٹی پریشان نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اب تک میں زندہ کیوں کر ہوں۔ مگر وہ میرے تیور دیکھ کر مجھ سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ میں بھی اسے رات کا خواب بیان کر کے اس کی پریشانی میں اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ بہت جلد میں نے ناشتہ کیا اور روی داس کے آنے سے پہلے میں شنکر کو ساتھ لے کر قلعہ سے باہر نکل گیا۔ میرا ارادہ نیا ڈاک بنگلہ دیکھنے کا تھا۔ شاید اس میں رہنے کی نوبت آہی جائے۔ شنکر نے کچھ کہا تو نہیں مگر میری خواہش کے اظہار پر وہ خوشی تو ضرور معلوم ہوتا تھا۔

قلعے کے قدموں میں لکڑی کا پل پار کر کے اور غربی جانب کوئی سو گز کے فاصلے پر

نسبتاً ایک میدانی جگہ پر نیا ڈاک بنگلہ بنایا گیا تھا۔ جدید وضع کا ڈاک بنگلہ جیسے دوسرے ہزاروں ڈاک بنگلے ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت نہ تھی۔ یہ مکمل طور پر مسافروں کے استعمال کے لئے بنایا گیا تھا۔ جدید سامان سے آراستہ۔ یہ سامان ہزار بار دوسری جگہوں پر دیکھ چکا تھا۔ ایک عجیب، جانی پہچانی پھیکی سی کیفیت اس ڈاک بنگلہ میں تھی۔ جیسی ہر ڈاک بنگلہ میں ہوتی ہے۔ جدید زندگی کی یک رنگی ہر جگہ اپنے آپ میں اس قدر ویران ہے کہ زندگی زندگی نہیں فارمولا معلوم ہوتی ہے اس ڈاک بنگلہ کے بالکل قریب ایک طرف شنکر کے لئے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کاج تھا۔ مگر پتھر کا نہیں، چیڑ کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ چھت بھی لکڑی کی تھی۔ جس پر خشک جھاڑیاں بچھا کر مٹی کوٹ کوٹ کر ڈالی گئی تھی۔ اس مٹی پر اب گھاس اُگ آئی تھی اور اس چھت کے عین بیچ میں ایک چمنی تھی جس میں سے اب تک ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

یہاں سے درختوں کے بیچ میں گھرا ہوا مندر کا عکس بہت قریب آنے لگا۔ میں نے شنکر سے کہا۔ چلو مندر بھی دیکھ لیں۔

مندر کا ٹیلہ قلعے سے نیچے تھا۔ مگر پھر بھی خاصہ اُونچا تھا۔ مندر تک جانے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے گنیں اکیاون سیڑھیاں تھیں۔ ٹیلے کے چاروں طرف دیوار اور چیڑ کے درخت تھے۔ مگر جوں جوں اُوپر بڑھتے گئے پھلدار درختوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ناشپاتی کے پیڑ اور سیب کے درخت اور انار کے پیڑوں سے لپٹ کر جھولتی ہوئی انگور کی بیلیں۔ جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ اور ان میں شہد کی مکھیوں کی گونج۔

سیڑھیاں چڑھ کر مندر کا بڑا دروازہ نظر آیا۔ جس کے اندر دیواروں سے گھرا ہوا ایک چوکور احاطہ تھا۔ دیواروں کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک طرف تلسی کا چھوٹا سا دیول تھا۔ دیول کے آگے ہری گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا اس کے آگے گیارہ سیڑھیوں کا ایک زینہ تھا زینے کے اوپر سیاہی مائل پتھروں کا منڈ

اپنے سر پر پیتل کے کلس کا تاج پہنے ہوئے سورج کی روپہلی دھوپ میں جگمگاتا ہوا نظر آیا۔

میں صحن کے اندر پہنچ کر تلسی کے دیول کو نظر انداز کر کے مندر کے آخری زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر شنکر سے کچھ کہنے کے لئے پیچھے جو مڑا تو اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔ تلسی کے پرانے شکستہ دیول کے پیچھے سے دو گلابی چرن مکمل نمودار ہو رہے تھے۔ بے حد سندر نازک پاؤں دھیرے دھیرے تلسی کے دیول کی بائیں طرف کی لمبی لمبی جھاڑیوں میں چلتے ہوئے اور ایک سپید ساری کا پلو ہوا میں لہراتا ہوا۔ شاخوں کے پیچھے چھپتا ہوا۔ پھر جھاڑیوں کے باڑھ سے نکل کر یکایک ایک لڑکی میرے سامنے آگئی۔ اور اسے دیکھ کر ایک ہلکی سی چیخ میرے مُنہ سے نکل گئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو کل رات میرے خواب میں آئی تھی۔!

میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ لڑکی بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہی سپید رُستا ہوا چہرہ گلابی غنچہ دہن، گہری کالی آنکھیں۔ اُداسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی۔ سیدھی مانگ اور کھلے بال اور ہاتھ میں تلسی کے پوجا کی تھالی اور تھالی میں ایک چھوٹا سا دیا۔ کسی کمزور اُمید کی طرح ٹمٹماتا ہوا۔

وہ لانبی لانبی بوجھل پلکوں کے اندر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کامل اجنبیت اور حیرت تھی۔ دو آنکھیں دھیرے دھیرے مجھے ٹٹول رہی تھیں۔ دو بڑی بڑی سیاہ پتلیاں گویا میرے ارد گرد پھیل کر گویا مجھے اپنے سیاہ ہالے میں لے رہی تھیں۔ چند ثانیوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف ان سیاہ پتلیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

یکایک میرے کانوں میں شنکر کی آواز آئی۔ "صاحب یہ بھوانی ماتا کی پجارن ہے۔"

مگر میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے بے اختیار شنکر سے کہا۔ "مگر یہ تو وہی لڑکی ہے جو رات کو میرے کمرے میں آئی تھی۔" لڑکی یہ بات سُن کر چونکی۔ شنکر کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔

"کل رات حضور نے وہ بھوت دیکھ لیا۔"

"بھوت نہیں، عین مین یہی صورت تھی۔"

"وہ یہ نہیں تھی۔" شنکر نے خوف سے کانپ کر کہا۔ "اس کی بڑی بہن تھی۔" میں حیرت سے اس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"مندر سے باہر نکل کر میں آپ کو سب قصّہ بتاؤں گا۔" شنکر نے میری بڑھتی ہوئی حیرت اور تجسس کو دیکھ کر کہا۔ لڑکی گھوم گئی۔ اب اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ اور اس کے کھلے، سیاہ لانبے بال کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ وہ تلسی کی پوجا کرنے لگی۔ میں کھڑا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ تلسی کی پوجا کر کے مُڑی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ کچھ بولی نہیں۔ پوجا کی تھالی ہاتھ میں لئے کھڑی مجھے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

"یہ بول نہیں سکتی۔" شنکر نے مجھ سے کہا۔ لڑکی چپ چاپ آگے بڑھ گئی اور مندر کی آخری سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میں ان دو گلابی چرن کملوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن کے اَن گنت دھندلے نقوش جانے کتنی بار مجھے اپنے ذہن کی پہنائیوں میں گھومتے دکھائی دیئے تھے۔ میں اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن ان قدموں کو تو پہچانتا ہوں۔ یہ کیا اسرار ہے؟

میرے قدم ہولے ہولے آپ ہی آپ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ مندر کے کھلے دوار کے اندر چلی گئی۔ اور بھوانی ماتا کی سیاہ مورت کے آگے جھک کر پوجا میں مصروف ہو گئی۔ میں دروازے کے باہر ہی سے ڈنڈوت کر کے واپس چلا آیا۔

"یہ سن سینتالیس کا واقعہ ہے صاحب۔" ہم دونوں مندر کے ٹیلے کے باہر ندی کے کنارے گھاس پر پاؤں پسارے بیٹھے تھے۔ اور شنکر مجھ سے کہہ رہا تھا۔ "پنڈت روی داس کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ ہری داس وہ اس مندر کا پجاری تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اولاد میں دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام شیونتی تھا۔ چھوٹی کا رتنا۔ بڑی کی عمر اس

وقت اٹھارہ سال کی ہوگی۔ یہ لڑکی رتنا اس وقت آٹھ نو سال کی ہوگی۔"

"ان لوگوں کا خاندان بہت پُرانا ہے صاحب۔ پرمار راجاؤں کے زمانے میں بھی اس گاؤں کی نمبرداری اس خاندان میں چلی آئی ہے۔ ایک بھائی نمبردار ہوتا تھا۔ تو دوسرا مندر کا پجاری۔ اگر ایک ہی اولاد ہو تو وہی نمبردار و ہی پجاری۔ اس مندر کے ساتھ بیس بیگھے دھان کی زمین بھی ہے اس زمانے میں ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ ادھر علاقہ کا نیا کلکٹر جافرسن صاحب شکار کھیلنے کے لئے آیا۔ پڑاؤ تلعے میں ڈالا۔ ان دنوں قلعے کی حالت بہت اچھی تھی سرکار۔ کلکٹر صاحب کے ساتھ تیس بتیس آدمی کا عملہ تھا۔ صاحب بہادر اپنے ساتھ سب کھانے کا سامان معہ گک لائے تھے۔ دن بھر شکار ہوتا۔ رات بھر جشن۔ خوب گھما گھمی ہوتی تھی۔ مجھ کو روز بخشش ملتی تھی۔ صاحب بہادر لوگ بہت بخشش دیتے تھے صاحب۔ آج کل .... وہ یکایک میری طرف دیکھ کر چپ ہوگیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر پانچ روپیہ کا نوٹ رکھا شنکر کی آنکھوں میں ایک عجیب حریص چمک آئی اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا اور نوٹ جیب میں رکھ کر کہنے لگا۔" ایک دن جافرسن بہادر نے رتنا کی بڑی بہن شیونتی کو مندر کے باہر ندی کے کنارے جھولا جھولتے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہوگیا۔ رات کو کھانے کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہنے لگے۔

"ویل شنکر بیرا تم بوت اچھا۔" یہ کہہ کر انھوں نے مجھے دس کا نوٹ دیا میں نے سلام کر کے رکھ لیا۔ "تم بوت بوت اچھا۔" کلکٹر بہادر پھر بولے اور دس کا ایک نوٹ مجھے دیا۔ میں نے پھر سلام کر کے اسے لے لیا۔

"ام تمھارا سروس سے بوت بوت کھوش ہے۔" صاحب بہادر نے مجھے اب کے تیس روپیہ بخشش میں دیئے۔ میں نے کمر تک جھک کر ان کو سلام کیا اور روپیہ لے لیا۔ وہ بولے:

"ام کو وہ مندر والا چھوکری مانگتا۔" میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا مگر کچھ بولا نہیں۔ صاحب بولا "ہم کو ایک دم وہ چھوکری مانگتا۔ تم ہم کو لا کے دے سکتا؟ میں نے

خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔

"ہم تم کو بوت بوت بخشش دے گا۔"

میں بولا۔ "سرکار۔ مائی باپ۔ وہ لڑکی شیونتی مندر کے پجاری کی لڑکی ہے۔ گاؤں کے سب سے بڑے برہمن اور سب سے پرانے خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کو ہاتھ لگانا بھی ناممکن ہے۔ ہو نہیں سکتا۔"

"ہم تم کو پچاس نہیں سو روپیہ دے گا۔ ہم وہ لڑکی مانگتا۔"

میں بولا۔ "سرکار پچاس کیا پچاس ہزار بھی دو۔ تو بھی نہیں لا سکتا۔ گاؤں میں بلوا ہو جائے گا۔" صاحب یہ بات سن کر چپ ہوگیا۔ اس کا چہرہ اُتر گیا۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ بس اتنا کہا۔ "دس مس۔ میں کمرے سے باہر چلا آیا۔ اس کے بعد صاحب تین دن اور ادھر رہا۔ شکار کھیلتا رہا۔ مگر پھر کبھی اس نے شیونتی کی بات مجھ سے نہیں کی۔ دو دن کے بعد اس نے اپنا سارا عملہ فیلہ واپس بھیج دیا۔ بس ایک گھوڑا اور اردلی رکھا۔ تیسرے دن رات کو شیونتی مندر سے غائب ہوگئی۔ چوتھے دن صبح جافرسن صاحب اپنا گھوڑا اور اردلی لے کر چلا گیا۔ مگر اتنی صبح گیا کہ کسی نے اسے جاتے نہیں دیکھا۔"

"تم کہاں تھے؟" میں نے شنکر سے پوچھا۔

"مجھے صاحب بہادر نے اپنے عملے کی بیراگیری کرنے کے لئے تیراہ تک ساتھ جانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ تیسرے دن جو لوٹا تو معلوم ہوا کہ شیونتی گھر سے غائب ہے اور صاحب بہادر جا چکا ہے۔ دو روز تک ہری داس اپنی بیٹی کو ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ اسے نہیں ملی تو ندی میں ڈوب کر مر گیا۔ اس دن سے اس رتنا کی زبان بند ہوگئی اور اس دن سے یہ کسی سے بات نہیں کرتی ہے۔ بس دن رات بھوانی ماتا کی پوجا میں مگن رہتی ہے۔ اس نے دُنیا چھوڑ دی ہے۔"

"ہوں سرکار۔" شنکر بولا۔ "گاؤں والوں کے شور مچانے پر ایک دفعہ ہری داس کا بڑا بھائی روی داس ہمت کر کے آلوک پور گیا۔ اور سرکار سے سب واقعہ بیان کیا۔ مگر ان

دنوں دیش تقسیم ہو رہا تھا اور جافر سن صاحب ولایت چلا گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جافر سن صاحب شیونتی کو اپنے ساتھ ولایت لے گیا اور وہ وہاں پر بہت خوش ہے، سایہ پہنتی ہے لپ اسٹک لگاتی ہے اور انگریزی میں گٹ پٹ کرتی ہے۔ کچھ لوگ بولتے ہیں جافر سن صاحب نے لڑکی کو رات بھر قلعے میں رکھا۔ اس کی عزت لے کر اسے جان سے مار ڈالا اور اس کی لاش کو گھوڑے پر لے جا کر جنگل میں کہیں پھینک دیا جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر یہ سچ ہے صاحب اس دن سے شیونتی کا کچھ پتہ نہیں۔ نہ وہ ملی نہ اس کی لاش۔ اب اس کا بھوت اس قلعے میں رہنے والوں کو ڈراتا ہے۔

اس دن کے بعد سے اس قلعے میں کوئی نہیں رہتا۔ اگر ٹھہرتا ہے تو دوسرے دن ہی بھاگ کر ڈاک بنگلہ میں آ جاتا ہے۔ میں خود صاحب قلعے میں کبھی نہیں سوتا ہوں۔ پر جو صاحب لوگ اِدھر آتا ہے، اسے خبردار کر دیتا ہوں ایک انجینئر صاحب نہیں مانے تھے۔ تو ان کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ سرکار شیونتی کا بھوت بہت خطرناک ہے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتا کر کہتا ہوں رات کو قلعہ میں مت سوئیے۔" شنکر میرے پاؤں پکڑنے لگا۔ میں نے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ "دیکھا جائے گا تم اپنا کام کر کے جاؤ۔" میں نے اسے بڑی سختی سے منع کر دیا۔ مگر دل اندر سے بہت ڈر رہا تھا۔

☆

دن بھر غاروں میں خاک کے بھرنے کے بعد جب لوٹا تو راستے میں رچرڈز کاٹج کے چوبی گیٹ پر اندر کی طرف تالہ لگا ملا۔ رچرڈز کاٹج کا باغیچہ بالکل سنسان تھا۔ اور پورچ میں کرسیاں نہیں لگی تھیں۔ مگر پورچ کے اندر بند دروازے کے پیچھے روشنی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ نسیمہ کا حاسد خاوند اپنی بیوی کو حراست میں لئے بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر... ایک لمحہ کے لئے میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ دوسرے لمحے میں نسیمہ کی درد ناک حالت پر مجھے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ تیسرے لمحے میں بے اختیار میرے قدم نیچے قلعہ کو جانے والے راستے پر مڑ گئے۔ حالانکہ دن کو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رات کو قلعہ میں نہیں نیچے کے ڈاک بنگلے میں رہوں گا۔ مگر جوں جوں قلعہ قریب آتا جا رہا تھا۔ میرا ارادہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ جب قلعہ کے اندر پہنچا، تو بس انجانی، غیبی اور پُر اسرار طاقت نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا۔ ایسا لگا جیسے میں اس ماحول سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کوئی عجیب و غریب کشش تھی جو مجھے اپنے کمرے کے جانب بلا رہی تھی۔ میں ہال میں زیادہ دیر نہ رک کر سیدھا اوپر اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ جب کمرے کے اندر پہنچا تو دیکھا کہ میرا سامان غائب ہے۔ شنکر میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "میرا سامان کہاں ہے؟" میں نے اس سے ڈپٹ کر پوچھا۔

"نیچے ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"صاحب نے بولا تھا ناں کہ آپ رات کو پیچھے سوئیں گے۔"

"نہیں" میں نے اس سے کہا۔ "میں یہیں سوؤں گا۔ سامان واپس لاؤ۔"

"صاحب!" شنکر کا چہرہ اُتر گیا۔

"میں کچھ سُننا نہیں چاہتا، سامان واپس لاؤ۔"

شنکر کچھ دیر کھڑا مُنہ دیکھتا رہا۔ پھر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ چند ثانیوں کے بعد سامان واپس لے آیا۔ آج میں نے شنکر سے نوکر خانے کی چابی بھی لے لی۔ اگر یہ بھوت باہر سے آتا ہے تو نوکر خانے کی طرف سے بھی آسکتا ہے میں نے اس سے ساتھ والے کمرے کی چابی بھی لے لی۔ جس کا دروازہ میرے غسل خانے میں کھُلتا تھا۔ ہوسکتا ہے، کوئی اس کمرے سے ادھر کے غسل خانے میں آکر اس کمرے میں آجاتا ہو۔ اب مجھے اس بھوت کا صحیح سُراغ لگانا ہی پڑے گا۔

شنکر کے جانے کے بعد میں نے ہال کا دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔ نوکر خانے کو اپنے ہاتھ سے تالا لگایا۔ باہر سے آنے جانے کے سارے راستے بند کرکے میں اپنے کمرے میں آگیا۔ پھر اُٹھ کر ساتھ والے کمرے کو کھول کر اسے اندر سے غور سے دیکھا۔ دونوں چٹخنیاں اچھی طرح سے چڑھا کے باہر نکل کے اس کا دروازہ بھی خوب دیکھ داکھ کے بند کرکے اپنے کمرے میں محصور ہوکر بیٹھ گیا اور یہ ارادہ پکا کرلیا کہ آج رات بھر نہیں سوؤں گا۔ دیکھوں گا یہ بھوت کدھر سے آتا ہے۔

دیر تک پڑھتا رہا۔ دیر تک پڑھتا رہا۔ آخر جب نیند نے زور مارا تو غسل خانے میں جاکر پانی کے چھینٹے مُنہ پر مارے اور پھر آکر پڑھنے لگا۔ پھر بھی جب نیند آنے لگی تو اُٹھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ایزل سامنے کھڑا کرکے غاروں میں بنائے ہوئے پنسل اسکیچ میں رنگ بھرنے لگا۔ پھر جب غنودگی کے غلبے سے رنگ بھی گڈ مڈ ہونے لگے تو ایزل سے ہٹ کر واپس اپنے بستر پر بیٹھا۔ اور پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ مگر نیند آئے چلی جارہی تھی۔ پپوٹے

بڑی مشکل سے کھُلے رکھ سکتا تھا بار بار آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کب ایک لمبی جھپکی سی آگئی اور میں بستر ہی پر نیم دراز حالت ہی میں لیٹے لیٹے نیم مدہوشی کے عالم میں اپنے حواس کھونے لگا۔

عجب سوتے جاگتے کا عالم تھا۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سو رہا ہوں۔ کبھی ایسا جیسے جاگ رہا ہوں۔ سب سے پہلے ایک عجیب تیز سی خوشبو میرے نتھنوں میں آئی۔ کچھ کچھ کافور سے ملتی جُلتی مگر بے حد تیز۔ احساس تاریک دھندلکوں میں کھونے لگے اور کوشش کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف تاریک دھند پھیل رہی ہے۔ وہ تیز خوشبو سی دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی۔ مگر اس خوشبو سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے مجھے بستر پر جکڑ دیا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ مگر میں حرکت نہ کرسکتا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا مگر بل نہیں سکتا تھا۔ عجیب نیم بیداری اور نیم مدہوشی کا عالم تھا۔

پھر اس تاریک دھند میں ایک سپید ہیولہ سا لرزنے لگا۔ سفید ساڑھی میں ملبوس ایک سپید گھُٹتے ہوئے اداس چہرے کے خدوخال ابھرنے لگے۔ جیسے کوئی اس دھند میں پنسل کی نوک سے چہرہ بنا رہا تھا۔ دو بڑی بڑی آنکھیں میرے بہت قریب آگئیں اور پھر مجھے ایسا لگا جیسے بے شمار روئی کے گالوں سے بھرے ہوئے میرے کانوں کے اندر کوئی آواز آرہی ہے اور ادھ کھلے ہونٹ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

"کون ہو تم؟"

"میں موتی لال ناگر ہوں۔ مگر سب لالی کہتے ہیں۔"

"لالی؟"

"ہاں لالی۔ مگر تم کون ہو۔؟"

"میں شیونتی ہوں۔"

"تم کہاں سے آتی ہو؟"

"کہیں سے نہیں۔ اسی قلعہ میں رہتی ہوں۔"

"اسی قلعہ میں کہاں؟"

"تمہارے آس پاس۔"

"آس پاس کہاں؟"

"تمہارے بہت قریب، تمہارے چاروں طرف۔"

میں چپ ہوگیا۔ اس نیم غنودگی کے عالم میں مجھے خیال آیا کہ آیا جو میں دیکھ رہا ہوں اور سُن رہا ہوں۔ وہ عالم خواب ہے یا بیداری۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر اس لڑکی کو چھونا چاہا۔ مگر میرے ہاتھ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اس لڑکی کی آواز جیسے دور دھند کے اندر کے کسی بھنور سے نکل رہی ہے۔ کچھ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ واقعی میرے سامنے ہے۔ اور ایسا بھی لگتا تھا جیسے جو دیکھ اور سن رہا ہوں وہ محض میرے ذہن کا واہمہ ہے۔ ایک خواب ناک کیفیت ہے۔ جس سے کوشش کرکے میں چھٹکارا نہیں حاصل کرسکتا۔ یہ کیا میں بات کر رہا ہوں؟ کہ اپنے ہی ذہن کے واہموں کی آواز سُن رہا ہوں؟ واقعی کوئی لڑکی مجھ سے کلام کر رہی ہے یا کہ یہ محض میرے لاشعور کی تھکی ہوئی بازگشت ہے۔

"شیونتی تم میرے پاس کیوں آتی ہو؟"

"مجھے چھٹکارا دے دو۔"

"کس سے؟"

"قلعہ کی دیواروں سے جنھوں نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ مجھے باہر نکالو۔ باہر نکالو۔ باہر نکالو۔"

کہتے کہتے وہ مجھ پر جھک گئی جھکتی چلی گئی۔ وہ ہونٹ، وہ ماتھا، وہ ستواں ناک وہ گہری سیاہ الم ناک آنکھیں میرے قریب آتی گئیں پھر ایک گہری سسکی کی آواز میں نے سُنی۔ اور جیسے دھیرے دھیرے وہ چہرہ میرے قریب دھند میں بدل گیا۔ نظروں سے غائب ہوگیا۔

اور میں گہری نیند میں مدہوش ہوگیا۔ معلوم نہیں کب تک اس عالم میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب جاگا تو کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ لیمپ کی بتی گل ہوچکی تھی۔ میں نے اُٹھ کر بتی جلائی اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں غسل خانے میں کہیں کوئی موجود نہ تھا۔ سب دروازے کھڑکیاں بند تھیں، مگر کمرے میں ایک بھینی بھینی کافور کی سی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

چند لمحوں کے لئے میں اپنے نتھنے پھلا پھلا کر اُسے سونگھتا رہا۔ واقعی تھی۔ کوئی عجیب سی خوشبو تھی کافور سے کچھ کچھ ملتی ہوئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اور لالٹین لے کر باہر آگیا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں بھی باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے تالا کھولا۔ اندر گیا۔ غسل خانے والا دروازہ بھی بند تھا۔ دونوں چٹخنیاں اسی طرح لگی تھیں۔ میں بھاگ کر دوسری غلام گردش میں گیا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ نیچے ہال میں ہال کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوکر خانے میں؟ وہاں بھی میرا لگایا ہوا تالا اسی طرح موجود تھا کوئی آیا نہ تھا۔ کہیں سے آ نہ سکتا تھا۔ ضرور یہ ایک خواب تھا۔ مگر جانے کیوں یہ خواب مجھے واقعی حقیقت سے زیادہ اصلی معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے واقعی شیونتی آئی تھی۔ آ کے چلی گئی۔ اور میرے کمرے میں کافور کی خوشبو چھوڑ گئی۔ اس کی وہ گہری میٹھی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ جیسے میں نے خواب میں نہیں واقعی عالم بیداری میں اسے سُنا ہو۔

سب طرف سے مایوس ہو کر واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ گھڑی کو دیکھا۔ چار بجا رہی تھی رات کے آخری پہر میں میں نے تھک ہار کر تکیے پر اپنا سر رکھ دیا اور چند منٹ کے بعد گہری نیند میں سو گیا۔

جب صبح جاگا۔ تو سب سے پہلے میں نے اپنے کمرے میں اس کافوری خوشبو کو سونگھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھینی بھینی عجیب سی خوشبو کسی دوسری دنیا سے آنے والی خوشبو بھی غائب

ہو چکی تھی رات کا سحر آمیز طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

دن بھر اپنا کام کرتا رہا۔ مگر آج کام میں دل نہیں لگا۔ خلا کے بھر رہا تھا مگر ذہن کسی اور ہی کے خلا کے بھرنے میں مصروف تھا۔ بار بار غاروں کی دیوار گیر تصویروں میں دھند سی بکھرنے لگتی اور شیونتی کا درد اور التجا میں ڈوبا ہوا چہرہ میری نگاہوں میں اُبھرنے لگتا۔ آج دوپہر کے فوراً بعد ہی میں نے اپنا سامان تہ کر کے رکھ دیا۔ اور قلعہ کی طرف چلنے لگا۔ روی داس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ آج چلتے چلتے میں نے رچرڈز کا ٹیج کی طرف نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ جوں جوں قلعہ قریب آتا جاتا تھا میرے لئے باہر کی دُنیا معدوم ہوتی جاتی تھی۔ پہاڑ۔ وادی۔ غار۔ گھاٹی میدان دھان کے کھیت۔ ندی کی مترنم صدا۔ جنگلوں کی خوشبو۔ چڑیوں کے گیت سب غائب ہوئے جا رہے تھے۔ وہ سب حقیقت نہ تھے اور جو حقیقت تھی وہ قلعہ کے اندر موجود تھی۔ اور ہر آن مجھے اپنے قریب بلا رہی تھی۔

شنکر بھی مجھے اتنی جلدی لوٹتے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ مگر اب میری طبیعت جان چکا تھا۔ کچھ نہ بولا۔ آج میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ جلدی کھانا کھایا اور وقت سے کچھ پہلے ہی اور پھر میں نے بہت جلدی شنکر کو قلعہ سے نکال کے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ کیوں کہ جب شنکر چلا جاتا تھا۔ تبھی یہ قلعہ مجھے اپنا محسوس ہوتا تھا۔

قلعے سے وہ اجنبیت اور غیریت دور ہو گئی تھی۔ اور وہ بیزار کن تاثر بھی اب قلعے کے ہولناک اندھیرے سے مجھے ڈر نہیں لگتا تھا۔ آج تو اس کے اندھیرے میں ایک عجیب سی اپنائیت تھی۔ ہر تاریک موڑ پر کوئی میری آمد کا منتظر معلوم ہوتا تھا۔ یہ ہال۔ یہ بند کمرے۔ یہ غلام گردشیں یہ تنہائیاں دھیرے دھیرے سانس لیتی ہوئی۔ کسی کے قدموں کی منتظر تھیں۔ میں دھیرے دھیرے

غلام گردشوں میں گھومتا رہا ہال میں ٹہلتا رہا۔ زینے پر کسی کا منتظر کھڑا رہا۔ منہ اُوپر اُٹھا کے ہوا میں نتھنے پھلا کر اس خوشبو کو سونگھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جو کسی کے قدموں کی چاپ کے ساتھ فضا میں بکھرنے لگتی ہے اور پھر جیسے کسی نے مجھ سے کہا کہ وہ یوں نہیں آئے گی۔ وہ اس دُنیا کی مخلوق تو ہے نہیں جس کا تم سیڑھیوں پر استقبال کرنا چاہتے ہو وہ تو ہولے سے سارے دروازے بند دیکھ کر تمہارے دل کے جھروکے سے تمہارے اندر چلی آئے گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور بستر پر لیٹ کر اس کا انتظار کرو۔

قلعہ کی تاریک دیواریں مُسکراتی ہوئی خاموشی سے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ وہ میرے ساتھ دور دور تک گئیں۔ جہاں تک میں چلتا گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلی گئیں۔ اندھیرے میں ان کی باہیں مجھے سہارا دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ آخر میں اپنے کمرے کو مُڑ گیا اور روز کی طرح کمرے میں بند ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

کچھ دیر تک پڑھتا رہا۔ پھر بتی گُل کر کے بستر پر لیٹ گیا اور گھور گھور کر تاریکی میں دیکھنے لگا۔ کچھ نظر نہ آیا۔ تاریکی کے سوا۔ چشم تصور پر زور دے کر شونتی کے چہرے کو تاریکی کے چوکھٹے میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ مگر تاریکی اور گہری ہوتی گئی دل کی دھڑکن جوں جوں بڑھتی جاتی، قلعے کا سناٹا اور گہرا ہوتا گیا۔ عالم خیال میں جوں جوں کسی کو دیکھنے کی شدت بڑھتی گئی۔ تاریکی کا خلا، وسیع تر ہوتا گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں تاریکی کے ایک ایسے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں جس کا آگے پیچھے کوئی کنارا نظر نہیں آتا۔ اس تاریک سمندر میں تیرتے تیرتے میں تھک سا گیا۔ میرے احساس جواب تک شدید انتظار کے عالم میں جاگ رہے تھے۔ مایوسی سے تھک کر بوجھل ہو کر پژمردہ سے ہو کر اونگھنے لگے اور رفتہ رفتہ میں پھر اس تاریک سمندر کے اندر ڈوبنے لگا۔ اور یکایک ان تاریک گہرے پانیوں کی سی کیفیت میں میرے کانوں میں گونج کے مدھم بلبلے سے چھوٹتی ہوئی ایک دھیمی دھیمی راگنی سُنائی دینے لگی۔

کہیں پر وہ دو گلابی چرن مکمل ناچ رہے تھے۔

میرے اُوپر خلا میں ــــ نہیں.... میرے کمرے کی چھت کے اوپر ناچ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اس سہری پائل کی کھنک اور تال میرے کانوں میں سمائے جا رہے تھے میں اپنے احساس پر شدید زور دے کر اس نیم غنودگی سے جاگ گیا۔ مگر کانوں میں ابھی تک وہی دھیما دھیما رقص گونج رہا تھا۔ لگتا تھا میرے کمرے کے اوپر کوئی ناچ رہا ہے۔ مگر میرے کمرے کے اوپر تو قلعے کا بڑا گول کمرہ ہے۔ اس میں اس آدھی رات کے وقت کون ناچ رہا ہے؟ شاید کسی رقاصہ کی یہ روح؟ پرمار راجاؤں کے زمانے کی نرتکی کی روح اب تک اس گول کمرے کے فرش پر ناچ رہی ہے۔ اور مہاراج ادھیراج اپنے درباریوں اور مصاحبوں کی سنگت میں جام لنڈھاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی آبدار تلواریں کمر سے باندھے ہوئے چاہت بھری نظروں سے اس نرتکی کو دیکھ رہے ہوں گے یکایک وہ آواز گم ہوگئی۔ جیسے اس آواز نے گول کمرا چھوڑ دیا ہو۔ پھر گول کمرے کے باہر چھم چھم کرتی ہوئی وہی پائل کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ سیڑھیاں اتر رہی ہو۔ غلام گردش میں چل رہی ہو۔ دھیرے دھیرے ناچتے ہوئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سارے جسم میں پسینہ پھوٹ نکلا۔ میں نے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اچانک وہ قدم میرے بہت قریب آگئے۔ اور میرے نتھنوں میں کافور کی وہی تیز خوشبو آئی اور میری غنودگی بڑھ گئی۔

میری آنکھیں کھلی تھیں اور میرا جسم جیسے فضا میں پھیلا ہوا تھا اور وہ ردائے شب میں کھلتی ہوئی ابھرتی ہوئی میرے بہت قریب نمودار ہو رہی تھی اس کا سارا جسم سفید ساری سے ڈھکا ہوا تھا۔ اندھیرے میں بس وہی حسین نازک چہرہ نمایاں تھا تاریک دھند کے مرغولوں میں تیرتا ہوا دو بڑی بڑی مسحور کر دینے والی آنکھیں پلک جھپکے بغیر اب مجھے دیکھ رہی تھیں وہ بہت بڑی آنکھیں تھیں اور وہ اس کے چہرے اور اس کے جسم اور میرے جسم سے بھی بڑی آنکھیں تھیں اور اس رات کی تنہائی میں وہ آنکھیں اداس اور محزون کسی اکیلی ان چھوئی گہری جھیل کے پانیوں کی طرح مقدس تھیں وہ ہونٹ ذرا سا کھلے۔

”بابو!“ وہ کراہ کر بولی۔

”لالی کہو۔“

”لالی مجھے بچا لو۔“ وہ سسک کر بولی۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”شونتی میرے قریب آجاؤ۔ میں تمھارے ہونٹوں پر اپنی ایک انگلی رکھ کر محسوس کر لینا چاہتا ہوں کہ تم واقعی ہو۔“

”ہوں تو ــــ کیا تم مجھے دیکھ نہیں سکتے۔“

”دیکھتا تو ہوں مگر چھو نہیں سکتا۔“

”چھونے کی کوشش بھی مت کرنا۔ ہوا میں گھل جاؤں گی۔“

”تو پھر میں تمھیں بچا کیسے سکتا ہوں؟“

”تم مجھے بچا سکتے ہو بابو۔“

”لالی کہو۔“

”لالی مجھے بچا لو۔“

”تمھیں کیا خطرہ ہے؟ کس سے خطرہ ہے؟“

”اس قلعہ کی دیواروں میں دم گھٹتا ہے۔“

”تو اس قلعہ سے باہر چلی جاؤ۔“

”نہیں جا سکتی۔“

”کیوں نہیں جا سکتی۔ لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ ابھی تمھیں اس قلعہ کے باہر لے چلتا ہوں۔“

اس نے دھیرے سے ایک لمبی آہ بھری بولی۔ ”اتنا آسان نہیں ہے ایک دفعہ جب روح کا ہاتھ جسم سے الگ ہو جاتا ہے تو پھر کیسے مل سکتا ہے۔“

”مجھے اپنی ساری کا کونا ہی چھو لینے دو۔“

"وہاں بھی دھندلکوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا لالی۔ میں مر چکی ہوں۔"

"مر چکی ہو۔ تو میرے پاس کیوں آتی ہو۔؟"

"اچھا۔" وہ مایوسی سے آہ بھر کر بولی۔ "کل سے نہیں آؤں گی تمھارے پاس۔"

جیسے وہ چہرہ تاریکی میں گم ہونے لگا۔ میں نے چلا کر کہا۔ "مت جاؤ۔ مت جاؤ ابھی میں نے تو یوں ہی غصّے میں کہہ دیا تھا۔"

وہ چہرہ پھر میرے قریب آگیا۔ پھر وہ لمبی لمبی سانسوں کے درمیان وہی بار بار سرگوشی میں کہنا۔ "لالی میرا دم گھٹتا ہے۔ میرا دم گھٹتا ہے۔"

"شونتی۔ تم زندہ ہو یا مُردہ۔"

"دونوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا۔ یہ بتاؤ۔ تم کیسے مر گئیں۔ کیا تم نے خودکشی کی۔ یا کسی نے تمھاری جان لے لی۔ یا تم کسی صدمے سے مر گئیں۔"

اس نے اپنی پتلی کانوری قلم کی طرح لمبی انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی۔ یہ میں تمھیں نہیں بتا سکتی۔

"اچھا یہ تو بتا دو۔ تمھیں مارنے والا کون تھا؟"

"اس کے ہونٹوں کی اداسی میں ایک چھوٹی سی مسکراہٹ اُبھری۔ زیادہ چالاک مت بنو۔ میں تمھیں اپنی موت کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"تو کب بتاؤ گی۔"

"جب وقت آئے گا۔"

"کھڑی کیوں ہو۔ بستر پر آکر بیٹھ جاؤ۔"

"تم مجھے چھو لو گے۔"

"وعدہ کرتا ہوں نہیں چھوؤں گا۔"

وہ دھیرے دھیرے پائل بجاتی ہوئی میرے بستر کی پائینتی پر بیٹھ گئی۔ مگر میری دسترس سے ذرا دور ..... بچ کر اور ہٹ کر۔

"وعدہ کرو روز آیا کرو گی۔"

"روز آ کے کیا کروں گی۔" اس نے دھیرے سے مجھ سے پوچھا۔

"تم کچھ مت کرنا۔ بس میرے پاس بیٹھ جایا کرنا۔ میں تمھیں دیکھا کروں گا۔"

"دیکھ کر کیا کرو گے۔"

"پیار کروں گا۔"

"مرے ہوؤں سے کون پیار کرتا ہے؟ اور اس پیار سے حاصل بھی کیا ہوتا ہے۔"

وہ ایک غریب مایوسی سے بولی۔

"تم تو زندوں کی طرح باتیں کر رہی ہو۔"

"تمھیں زندہ دیکھ کر ایسی ہی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔"

"تو کیا تم چاہتی ہو۔ میں مر جاؤں۔؟"

"چھی! بابو ایسی باتیں مت کرو۔ بدنصیب شونتی کو یہاں سے جانا تھا وہ جا چکی تمھارا وقت ابھی نہیں آیا۔ تم اپنے وقت سے جاؤ گے۔ مگر اس سے پہلے بہت کچھ ہو گا تم محبت کرو گے اور شادی کرو گے اور بال بچے ہوں گے تمھارے اور تم ہنسی خوشی زندگی بتا کر اس جہان سے جاؤ گے۔ بدنصیب شونتی کی طرح نہیں۔"

وہ دھیرے دھیرے رونے لگی۔

میں نے اس سے کہا۔ تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کب سے میں تمھیں ڈھونڈھ رہا ہوں اس دُنیا کی تو کسی عورت سے میں پیار نہیں کر سکتا۔ سدا میری کلپنا میں دو گلابی چرن کمل

دولتے رہے ہیں۔ اس دن جب میں نے تمھیں آتے دیکھا۔ تو میرا دل ان قدموں کو پہچان کر خوشی سے کانپنے لگا۔ یہ بہت ہی پُراسرار بات ہے۔ مگر بالکل سچ بات ہے۔"

"اگر سچ بات بھی ہو تو بڑی خوف ناک بات ہے لالی۔ میں مر چکی ہوں اور تم زندہ ہو۔ تمھارا میرا پیار کیسے ہو سکتا ہے؟ تمھاری دُنیا اور میری دنیا کے درمیان جو کھائی ہے۔ اسے کون پاٹ سکتا ہے۔"

"شاید میں چھلانگ لگا دوں گا۔ کھائی کو دجاؤں گا۔"

"نہیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔ "ایسا کبھی مت کرنا کبھی مت کرنا۔"

پھر وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ پھر کیوں اندھیرے میں کان لگا کے سننے لگی جیسے سناٹے میں کسی آواز کو تلاش کر رہی ہو۔ یکایک وہ اُٹھ کر بولی۔ مجھے جانا چاہیے۔ مجھے جانا چاہیے۔ وقت ہوگیا۔ بلاوا آگیا۔"

"کون بلا رہا ہے تمھیں؟"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دھیرے دھیرے وہ مجھ سے دور ہوتی گئی۔ میں نے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ وہ بولی۔ "بستر سے اُٹھنے کی کوشش مت کرو۔"

مگر میں نے اس کی بات نہیں مانی۔ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ دور ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہت کوشش کر رہا تھا۔ مگر کسی غیر قدرتی طاقت نے میرے قویٰ شل کر دیئے تھے۔ وہ فضا میں تیرتی تیرتی میرے کمرے کے اندر غسل خانے میں چلی گئی تھی۔ بے حد کوشش کر کے آخر میں اپنے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سر منوں بھاری ہے اور جسم کا ہر رونگٹا رعشے سے کانپ رہا ہے۔ بڑی مشکل سے میں چل کر غسل خانے کے دروازے تک پہنچا۔ کئی منٹ کوشش کرنے کے بعد میں نے غسل خانے کے دروازے کو اپنے ہاتھ سے دھکا دینے تک کامیاب ہوا۔ دروازہ کھل گیا۔

غسل خانہ خالی تھا۔ غسل خانے میں کوئی نہیں تھا۔ غسل خانے میں وہی کافور کی خوشبو چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔

پھر میں غسل خانے میں گر گیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا۔ صبح کو شنکر نے گاؤں کی مدد سے نوکر خانے کا دروازہ توڑ کر کھلوایا۔ اور مجھے اس غسل خانے میں گرا ہوا پایا۔ پہلے تو شنکر یہی سمجھا کہ میں مر چکا ہوں۔ مگر بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ میں ابھی تک گہری نیند میں سو رہا ہوں۔

٭

شنکر اور روی داس اور گاؤں کے دوسرے لوگوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ آج سے میں اس قلعہ میں نہ سوؤں۔ مگر اب تو شونتی میرے قلب و احساس پر اس قدر حاوی ہو چکی تھی کہ اگر میں چاہتا بھی تو اس قلعہ کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔

میرے لئے اب دن، دن نہیں رہا۔ جدائی کا ایک طویل زخمی لمحہ بن گیا۔ درد سے چور۔ کرب آشنا۔ کب شام ہوگی۔ کب رات آئے گی۔ کب وہ دیکھنے کو ملے گی۔ وہی جو ایک حقیقت ہے۔ اس بھوتوں بھری دُنیا میں۔ ورنہ یہ سنہری وادی ایک سپنا ہے۔ یہ درخت۔ یہ گاؤں۔ یہ مکان۔ یہ لوگ۔ یہ گھاٹیاں کسی غیر حقیقی سپنے کی جھوٹی پرچھائیاں ہیں۔ مجھے مایا کے ان جھلملاتے عکسوں سے گزر کر اس حقیقی تاریک رات تک پہنچنا ہے۔ جس کی کافوری خوشبو کے ہالے میں میری شونتی رہتی ہے۔

آج میرا سر بھاری تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ آج میں نے شیو نہیں بنائی۔ نہایا بھی نہیں۔ کپڑے بھی نہیں بدلے۔ دن کا کھانا بڑی بے دلی سے کھایا اور رات کو تو کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ رات کے آنے کے ساتھ ساتھ ہر لمحہ میری بے قراری بڑھتی جاتی تھی۔ بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ اور تاریکی کا انتظار کرتا تھا۔ کیوں کہ رات عشق کی سحر ہے۔ جب حسن کا سورج چڑھتا ہے۔ اور شوق کا سمندر ساحل سا حل بڑھتا ہے۔ محبت کے ماہی گیر اپنا جال پھینکتے ہیں اور مچھلی اپنے سینے میں کئی درد کا کانٹا لئے اپنی آرزوئے شوق میں گرفتار بے محابا اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی آتی ہے۔

مگر یہاں یہی نہیں معلوم تھا۔ کون ماہی گیر ہے۔ کون مچھلی۔ میں کبھی ماہی گیر کی طرح اپنا کمرہ بند کر کے چاروں طرف کی چٹخنیاں اچھی طرح سے دیکھ کر ٹٹولتا جال پھینکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی اپنے سینے میں وہی کانٹا محسوس کرتا تھا۔ جس کی کرب ناک شدت میں گرفتار ہو کر مچھلی ماہی گیر کے پاس چلی جاتی ہے۔ جو خود ہی مچھلی ہو، خود ہی ماہی گیر اس کے عشق کا انجام کیا ہوگا۔؟

رات بھر انتظار کیا۔ رات بھر جاگا۔ مگر شونتی نہیں آئی۔ آنکھیں کھول کر اسے بُلایا۔ آنکھیں کھول کر اسے یاد کیا۔ بستر پر اوندھا لیٹا۔ سیدھا لیٹا۔ چت لیٹا۔ پٹ لیٹا۔ تاریکی میں باہیں پھیلائیں کمرہ کھول دیا کہ ممکن ہے اسے آج بند دروازوں کے اندر آنے میں کوئی دقت محسوس ہوئی ہو۔ نیچے ہال میں گیا۔ اُوپر زینے پر گیا۔ غلام گردشوں میں چکر لگائے۔ دیواروں سے ٹٹول ٹٹول کر پوچھا۔ آج شونتی کہاں ہے۔ آج شونتی کیوں نہیں آئی۔ رات بھاگی چلی جا رہی ہے۔ مگر آج شونتی کیوں نہیں آئی؟ دوسری غلام گردش کی ساری کھڑکیاں کھول ڈالیں اور سر باہر نکال کر نیچے دونوں ندیوں کے پانیوں کی مترنم سسکیاں سُنتا رہا۔ آج تو پرانی ندیوں کا پانی بھی گلے مل کے روتا ہے۔ اور زور زور سے کراہتا ہے۔ آج ہوا کھڑکیوں کے کانچ سے لپٹ کر کیوں سسکاں لیتی ہے۔؟ کیا یہ سب جانتے ہیں کہ آج شونتی نہیں آئے گی؟ اور اگر آج نہیں آئے گی تو ممکن ہے کبھی نہ آئے تو پھر میں کہاں کہاں ڈھونڈوں گا۔ سونتی۔ تیرا تو کوئی پتہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے۔ اور تیرا گاؤں بھی میں نہیں جانتا۔ دوسری لڑکیوں کا تو کوئی گھر ہوتا ہے۔ وہ کسی گاؤں میں رہتی ہیں کسی پن گھٹ پر جاتی ہیں۔ گلی کے کسی موڑ پر پگڈنڈی کے کسی چھور پر انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر تجھے میں کہاں ڈھونڈوں گا شونتی۔ اگر تو خود میرے پاس نہ آئے گی۔ تو میری آرزو کیسے تجھے اپنے پاس بلا لے گی.....

وہ رات اور اس کے بعد دوسری رات اور پھر تیسری رات بھی اس طرح گزر گئی۔ شونتی مجھے دکھائی نہیں دی اور شب و روز اسے دیکھنے کی چاہت میرے دل میں بڑھتی گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ دن بھر غاروں میں کام کرتا تھا اور رات کو جاگ جاگ کر قلعہ کی دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا اور اُونچی اُونچی دیواروں والی غلام گردشوں میں گھوم گھوم کر پوچھتا تھا۔ شونتی تم کہاں ہو؟

کہاں ہو؟ شونتی بس ایک بار آجاؤ۔ بس ایک دفعہ اپنی صورت دکھا دو شیونتی۔ شیونتی!

چوتھے دن جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو خوف سے لرز گیا۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی آنکھیں خوفناک اور سُرخ۔ چہرہ لال اور تپا ہوا۔ سارا جسم کسی اندرونی بخار سے پھنک رہا تھا۔ گاؤں والوں نے مجھے شاید کوئی پاگل یا خبطی سمجھ کر مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ روسی داس بھی آج نہیں آیا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں اکیلا ہی آج غاروں میں کام کرنے چلا گیا۔ مگر دوپہر کے بعد کام کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ سر میں زور کا چکر آ رہا تھا۔ اور سارا جسم رہ رہ کر کانپتا تھا۔ بڑی مشکل سے میں شام تک واپس اپنے قلعہ میں پہنچا۔ اور جاتے ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ شنکر نے میری حالت دیکھ کر میرے دونوں پاؤں پکڑ لئے اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "صاحب کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ اب بھی میری بات مان جاؤ۔ اور نیچے ڈاک بنگلے میں چلے چلو۔"

مجھے اس قدر غصہ آیا کہ میں اپنی تھری ناٹ تھری لے کر اس کے پیچھے دوڑا۔ اور وہ بے چارہ اپنی جان لے کر قلعہ کے باہر بھاگ گیا۔ میں نے جلدی سے قلعہ کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر بستر پر پڑ گیا۔ اتنا مجھے معلوم تھا کہ مجھے بڑے زور کا بخار ہے اور میرا سارا جسم کسی اندرونی حدت سے جل رہا ہے۔ پھر بستر پر پڑنے کے بعد مجھے کچھ احساس نہیں رہا کہ میں کہاں پر ہوں۔

کب تک اور کتنے دن میں اس حالت میں پڑا رہا۔ مجھے خود معلوم نہیں۔

مبہم طریق پر کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ بخار کی اس ہذیانی کیفیت میں ایک بار اپنے تپتے ہوئے ماتھے پر کسی کی ٹھنڈی کافوری انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں کھولیں تو اس کے چہرے کو اپنے چہرے پر غور و فکر سے جھکا ہوا پایا۔ وہ دھیرے دھیرے میرے ماتھے پر اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ میرا ہذیانی واہمہ ہو۔ یا شدید بخار کا اثر ہو۔ لیکن مجھے یہی یاد پڑتا ہے کہ بخار کے عالم میں پہلی بار جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے شونتی کو اپنے چہرے پر جھکا ہوا دیکھا تھا۔ اور اس کی خنک کافوری انگلیاں میرے ماتھے کو سہلا رہی تھیں۔

شونتی! میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی جیسے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی ہو۔

"تم کہاں تھیں۔؟ اتنے دنوں کیوں نہیں آئیں؟"

"شش! تم بیمار ہو۔ مت بولو۔"

وہ بڑے پیار سے میرے ماتھے کو سہلا رہی تھی۔ میں اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کر سکتا تھا۔ آج وہ خود میری کسی خواہش کا اظہار کئے بغیر میرے پلنگ پر جھکی بیٹھی تھی۔ اور اس کا ہاتھ میرے سر پر تھا اور میں نے اس کی کلائی کو چھو کر دیکھا اور میرے چھونے پر وہ کہیں غائب نہیں ہوئی۔ اسی طرح میرے بستر پر بیٹھی میرا ماتھا سہلاتی رہی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

شونتی نے کہا۔ "کہیں نہیں۔ یہیں تمہارے پاس تھی۔"

"پاس تھیں؟ تو نظر کیوں نہیں آئیں؟"

"کیوں کہ تم نے مجھے چھونے کی کوشش کی تھی۔"

"اور اس وقت خود سے چھو رہی ہو۔"

"اس وقت تم بیمار ہو۔ اور تمہیں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔"

"میں تم سے باتیں نہ کروں گا تو مر جاؤں گا۔"

"مرنے کی بات مت کرو تمہیں تو لمبی عمر تک جینا ہے۔ مر تو میں چکی ہوں۔"

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "لالی سونے کی کوشش کرو۔"

"سونے کی کوشش کروں۔ میں نے اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھا ہے۔ اگر تم اتنے دنوں غائب نہ رہتیں تو میں بیمار نہ پڑتا۔"

"اور جب میں نہیں تھی تو کیا تم زندہ نہیں تھے۔"

"زندہ تھا۔ تمہاری تلاش کے لئے، تمہیں پانے کے لئے......"

"اور تم نے مجھے اس وقت پایا جب میں مر چکی ہوں۔ مجھ سے پیار کرنے کی کوشش نہ کرو لالی۔ بھلا سائے سے بھی کسی نے پیار کیا ہے۔ تمھارے اور میرے درمیان موت کی کھائی حائل ہے۔ مجھ سے پیار کر کے بھی تمھیں کیا ملے گا۔"

"میں اس کھائی کو پھلانگ جاؤں گا۔ موت میرے لئے کتنا ہی طویل سفر کیوں نہ ہو۔ میں اسے طے کر لوں گا۔ اگر اس کا مجھے یقین ہو جائے کہ موت کے بعد تم مجھے ملو گی۔ میں نے اس کی نازک کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی اور ان کافوری انگلیوں کو دیوانہ وار چومنے لگا۔ اس کا سینہ زور زور سے دھڑکنے لگا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور اس نے ایک اضطراری حرکت سے اپنا ہاتھ مجھ سے چھڑا لیا۔ اور گھبرا کر بولی۔ تم جانتے نہیں ہو۔ کس کس جتن سے میں تمھارے پاس آتی ہوں۔ اور تمھارے پاس آنے میں مجھے کس کس مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں تو نہ آتی مگر تمھیں بیمار دیکھ کر اپنے آپ کو آنے سے باز نہ رکھ سکی۔ کیوں تم موت اور پیار کی باتیں کرتے ہو۔ ابھی تو تمھیں شونتی کی مدد کرنا ہوگی اور اسے اس قلعہ کی چار دیواری سے باہر نکالنا ہوگا۔"

"میں تمھیں اپنی بانہوں میں اٹھا کر باہر لے جاؤں گا تم حکم تو کرو۔" میں نے اس سے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ "تو ابھی میرا حکم یہ ہے کہ تم سو جاؤ آنکھیں بند کر لو اور سو جاؤ۔"

"اگر سو گیا تو تمھیں دیکھوں گا کیسے؟ اتنے دن کے بعد تو دیکھنے کو ملی ہو۔"

"دیکھ تو نہیں سکو گے۔ لیکن محسوس کر سکو گے۔" شونتی آہستہ سے پُر اعتماد لہجہ میں بولی "آنکھیں بند کر لو!" اس نے حکم دیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر پہلی بار میرے نتھنوں میں گلاب جل کی خوشبو تیرنے لگی۔ شونتی میرے ماتھے پر ندی کے برفیلے پانی اور گلاب جل کو ملا کر اپنی ساڑی کے پلو کو بھگو کر اس کی پٹیاں بنا کر اور بھگو کر میرے ماتھے پر رکھ رہی تھی اور ہولے ہولے ایک گیت گنگنانے لگی۔ اب نہ وہ گیت یاد رہ گیا ہے۔ نہ اس کے بول یاد ہیں۔ بس اس کا ایک پرتو سا رُوح

پر باقی رہ گیا ہے۔ وہ کچھ یوں گنگنا رہی تھی۔ کوئی لوک گیت تھا کیا؟

رات کو گنگا نہیں بہتی۔
ایک رات مرد ہے۔
ایک رات عورت ہے۔
دن وہ رقیب ہے۔
جو رات کو رات سے جُدا کرتا ہے۔
رات کو گنگا نہیں بہتی۔
گنگا صرف دن میں بہتی ہے۔
رات کو وہ کالا کپڑا پہن کر نکلتی ہے۔
اور وہاں وہاں جاتی ہے جہاں گنگا نہیں جاتی۔
اور جنگلوں میں وادیوں میں اور عورت کے دل میں جاتی ہے اور پوچھتی ہے میرا ستیہ دان کہاں ہے؟ ساوتری تو صرف ایک رات ستیہ دان کو ڈھونڈنے نکلی تھی۔ میں تو ہر رات اسے ڈھونڈتی ہوں اور ہر رات موت کے دروازے سے گزرتی ہوں۔
دن کو پھر گنگا بن جاتی ہوں۔ اور پانی کا گھونگھٹ اوڑھ کر بہنے لگتی ہوں۔
کیوں کہ دن مرد ہے۔
اور رات پریم ہے۔
رات کو گنگا نہیں بہتی۔
صرف آنسو بہتے ہیں۔

اس کی سُریلی سحر آفرین لوری سُنتے سُنتے میں سو گیا۔ یہ لوری بھی تھی۔ تھپکی بھی تھی۔ گیت بھی تھا۔ شکایت بھی تھی۔ محبت بھی۔ عرض حال بھی۔ آرزوئے وصال بھی میں اس کے گیت کی صدا ہیں اور اس کی کافوری انگلیوں کے ٹھنڈے میٹھے لمس میں لپٹا لپٹا سو گیا۔

بس کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جب جب آنکھ کھلی وہ میرے ماتھے پر برفیلے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ یا میرا سر اپنی گود میں رکھ کر اسے سہلا رہی تھی۔ یا میرا بدن داب رہی تھی۔ میرے سوکھے ہونٹوں میں پانی ٹپکا رہی تھی۔ یا میرے لئے شوربا کا پیالہ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑی ہے اور چمچہ چمچہ کر کے شوربا میرے مُنہ میں ٹپکا رہی ہے۔ اپنی اس طویل علالت کے دوران میں اس کی ایک ہزار ایک ایسی تصویریں ہیں جو ذہن میں محفوظ ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایک رات جب میری حالت بہت خراب تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ شاید میں مر رہا ہوں میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے تھے اور میں نے اس ہذیان میں بڑبڑا کر اس سے کہا تھا۔

"روتی کیوں ہو۔ میں تو تم ہی سے ملنے آ رہا ہوں"

اور وہ چیخ مار کر میرے سینے سے لگ گئی تھی اور اس کا کانپتا لرزتا ہوا عورت کا جسم چند ثانیوں کے لئے میری باہنوں میں تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی میرا واہمہ ہو۔ لیکن میں ان چند لمحوں کی یاد اپنے دل سے کیسے بھلا سکتا ہوں۔ جب میری دونوں باہنیں خوشی سے بھر گئی تھیں۔ پھر مجھے کچھ یوں بھی یاد پڑتا ہے کہ اس رات ایک پل کے لئے اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ میں جب کبھی ہذیان میں بڑبڑا کر جاگتا۔ اسے اپنے اُوپر جھکا ہوا پاتا یا اپنے جسم سے لگا ہوا پاتا مجھے دھندلے دھندلے سایوں کی طرح وہ لمحے یاد نہیں جب میں نے اس کے گال سے اپنے گال لگائے تھے۔ اس کے ہونٹ چوم لئے تھے اسے بے قرار ہو کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ پاؤں کی پور سے سر کی سرسراتی ہوئی زلف تک میری ہو گئی تھی۔ یہ سب واہمہ تھا کہ بخار کا آتشیں ہذیان کہ شدتِ تصور کا تاثر۔ جو دھندلے دھندلے سپنوں اور غبار آلود خوابوں کی صورت میں اب تک مجھے اس طرح یاد ہے۔ جسے اب تک کوئی ٹھوس سے ٹھوس حقیقت بھی یاد نہ رہی ہو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں اور کوئی اس آدمی کے کہے کا اعتبار بھی کیا کرے گا جسے حقیقت سے زیادہ جذبات یاد رہتے ہوں۔ جو تصویر سے زیادہ تصور پر یقین رکھتا ہو۔ ورنہ یوں وقت تو ہر ایک کو دیا جاتا ہے۔ لیکن لمحے کس کس کو ملتے ہیں آنکھیں

تو سب کے پاس ہوتی ہیں لیکن دیکھتا کوئی کوئی ہے۔ بس ان راتوں کے چند ٹکڑے میری ہتھیلی پر رہ گئے ہیں۔ جب میں نے کسی نادیدہ جسم کو اک آہ کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ جب میں نے وہ ہونٹ چومے تھے، جو تھے ہی نہیں جب میں نے اس عورت سے پیار کیا تھا جو منزلِ ادراک سے دور موت کی گھاٹی کے پرے کہیں رہتی تھی۔ جس کا جسم گوشت پوست کا نہیں رات کی تاریکی سے بنا تھا۔ یا خیال کے گلاب سے بنا تھا۔ یا مرنے والی کی کسی ناگفتنی حسرت سے بنا تھا۔ یہ میں اس لئے بھی کہتا ہوں۔ کیوں کہ میرا خیال ہے کہ مردے کہیں نہیں جاتے۔ وہ یہیں قریب کہیں رہتے ہیں۔ صرف زندہ لوگ کہیں چلے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں اس کی دیکھ ریکھ سے اچھا ہونے لگا تھا کبھی اس دوران میں شنکر بھی آیا تھا؟ مجھے کچھ یاد نہیں روی داس آیا تھا؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ کب دن نکلا، کب رات ہوئی۔ کتنے دن کتنے ماہ و سال کتنی صدیاں کتنے ہزار سال بیت گئے مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس یاد ہے تو وہ چہرہ۔ وہ پاؤں۔ وہ انگلیاں۔ وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی مسکان، وہ چنبیلی کے پھول کی طرح اپنے آپ میں کھویا ہوا سپید چہرہ اور بیچ بیچ میں میرا غافل ہو کر یا مدہوش ہو کر یا بخار کے غلبے سے متاثر ہو کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا۔ جب ساری دُنیا مختصر ہو کر کافور کی ایک ڈلی میں سمٹ آتی تھی۔ پھر ایک بہت لمبی رات آئی۔ جب میرے اِرد گرد چاروں طرف کچھ نہ تھا۔

جب میں ہوش میں آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک نئے ماحول میں پایا۔ میں قلعہ کے اندر نہیں تھا۔ ایک روشن کھلے کمرے میں میرا بستر لگا تھا اور میرے قریب کرسی پر نسیمہ بیٹھی مُسکرا رہی تھی۔

میں نئے ڈاک بنگلے میں تھا اور شنکر میرے پائینتی بیٹھا ہوا پٹی سے لگا میرے پاؤں میں کچی لوکی کے گودے کی مالش کر رہا تھا۔ میرے پاؤں میں عجب ایک ٹھنڈی ٹھنڈی کیفیت کا احساس تھا۔

دوسرا احساس مجھے لیٹے لیٹے یہ ہوا کہ میرا سارا جسم کسی ریگستان کی طویل مسافت طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔ سارا جسم بے حد پیاسا اور کمزور معلوم ہوتا تھا۔ ہونٹ سوکھے تھے حلق میں چھالے پڑے تھے۔

نسیمہ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر مسکرائی۔ "شکر کرو تم بچ گئے۔ ورنہ قلعہ کے بھوت نے تمھاری جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔"

"تم کب سے یہاں ہو؟" مجھ سے فقرہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔

"بیگم صاحبہ تین دن سے یہاں ہیں۔" شنکر نے لوکی میرے پاؤں میں گھستے گھستے کہا۔

"یہی آپ کو قلعہ سے اٹھوا کر اس ڈاک بنگلے میں لے کے آئی ہیں۔"

"کیوں" میں نے پوچھا۔

"تو کیا میں تمھیں اس چڑیل شونتی کے ہاتھوں مرجانے دیتی؟" نسیمہ نے

چہک کر مجھ سے پوچھا۔

پھر شنکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ تمھارا پہاڑی ہیرہ بہت بے وقوف ہے۔ اس دن سے تم اس قلعہ میں بیمار پڑے تھے، لیکن اس کی ہمت نہ ہوتی تھی تمھیں وہاں سے لانے کی۔ کہتا تھا کہ صاحب خفا ہوں گے۔" میں نے کہا: "ارے بچ جائیں تو خفا ہوں گے، یہاں اس چڑیل کے قبضے میں تو مر جائیں گے۔"

"چڑیل" کے لفظ پر میرے چہرے پر جو رنگ آئے ہوں گے انھیں دیکھ کر نسیمہ نے جل کر کہا۔

"تمھیں اچھا نہیں لگ رہا ہے نا"؟ میں اگر تمھیں مرجانے دیتی تو اچھا تھا کیوں؟"

میں نے لیٹے لیٹے درگزر کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر مجھ سے مسکرایا نہیں گیا۔ نسیمہ نے کلائی کی گھڑی دیکھ کر شنکر سے کہا:

"وقت ہو گیا ہے، صاحب کے لئے سوپ لاؤ۔"

جب شنکر چلا گیا تو نسیمہ میرے قریب کھسک کر بولی:

"اگر روی داس مجھے بروقت اطلاع نہ کرتا تو اب تک تم ختم ہو چکے ہوتے پھر میرے شوہر کو بھی تم پر رحم آگیا۔ ایسے لمحے اس پر بہت کم آتے ہیں۔ انھوں نے مجھے یہاں بھجوا کر تمھاری نرسنگ کی اجازت دیدی۔ ان پہاڑوں کی جڑی بوٹیوں سے تم کیا اچھے ہوتے۔ وہ تو شکر کرو کہ ہمارے پاس دواؤں کا اسٹاک ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے ماہ سم آلوک پور سے دواؤں کا اسٹاک منگاتے ہیں۔ آج پورے تین دن ہو گئے ہیں مجھے دن رات اس کمرے میں رہتے ہوئے۔"

میں نے اس کی آنکھ کے اشارے سے اس بستر کو دیکھا جو کمرے کے دوسرے کونے میں لگا تھا۔

"تم نے میری جان بچائی ہے۔" میں نے رُک رُک کر کہا۔

اس نے میرے ہاتھوں کی جنبش دیکھ کر فوراً کہا "ہاتھ مت جوڑو تم ہندوؤں کی یہ حرکت مجھے سخت ناپسند ہے ضرورت بے ضرورت ہر وقت ہاتھ جوڑتے رہتے ہو" وہ زور سے ہنسی پھر ایک دم لہجہ بدل کر کہنے لگی "کیا اس دُنیا میں تمھیں کوئی اور عورت نہیں ملی تھی جو تم نے اپنی محبت کے لئے ایک مردہ لڑکی کا انتخاب کیا اور وہ ایسی مُردہ کہ جس کی ہڈیوں تک کا پتہ نہیں!"

"تمھیں کیسے معلوم؟" میں نے کمزور لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی۔

"ارے مجھے کیا سارے گاؤں کو معلوم ہے۔ جب تم بخار کے ہذیان میں مبتلا ہو کر قلعہ کے اندر دوڑتے پھرتے تھے اور شونتی شونتی کہہ کر قلعہ کی دیواروں سے ٹکریں مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ پھر جب میں یہاں تمھیں لے کر آئی اس وقت بھی تم سرسام کے عالم میں شونتی شونتی کہتے رہتے تھے۔ ان تین دنوں میں میں تو عاجز آ گئی۔ یہ نام سُنتے سُنتے۔ اگر کوئی زندہ لڑکی ہوتی تو مجھے اس قدر کوفت نہ ہوتی۔ مگر وہ بھی ایک مُردہ لڑکی ــــ لاحول ولا .... توبہ ..... توبہ ....."

شام کو وہ چلی گئی۔ جاتے وقت کہہ گئی۔ "آج سے تم اس قلعہ میں رات کو کبھی قدم نہ رکھو گے ورنہ میں تمھارے باپ کو خط لکھ دوں گی۔ میں نے تمھارے سائے کا غذات دیکھ لئے ہیں۔ تمھارے دادا تو میرے والد کے بہت عزیز دوست تھے حالاں کہ ہندو تھے مگر خیر جانے دو۔ اصل بات یہ ہے کہ اب ذمّہ داری میری ہے۔ تم نہایت ہی ذکی الحس فلسفہ میں ڈوبے ہوئے غیر عملی احمق اور روحانیت میں یقین رکھنے والے نوجوان ہو اس لئے اب تم پر کڑی نظر رکھنا بہت ہی ضروری ہو گیا ہے۔ اگر تم نے اپنی علالت کے دوران میں یا اس کے بعد بھی قلعہ کے اندر قدم ..... رکھا تو میں فوراً تمھارے باپ کو خبر کر دوں گی۔ آلوک پورے تار دلواؤں گی وہ فوراً آ جائیں گے اور آ کر تمھیں لے جائیں گے۔ مجھے معلوم ہے تم ان کے اکلوتے بیٹے ہو۔ اس لئے انکار بھی نہ کر سکو گے" شنکر کے کہنے لگی "اگر صاحب قلعہ میں گھسنے کی کوشش کریں تو مجھے فوراً خبر کر دینا۔ خیر اگلے دو تین روز تک تو بستر سے

اُٹھ بھی نہ سکیں گے پھر بھی اگر کوشش کریں تو بستر ہی پر رسّی سے باندھ دینا۔ یہ میرا حکم ہے سمجھے؟"

"جی" شنکر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"میں جاتی ہوں" نسیمہ نے مجھ سے کہا۔ "تین دن سے گھر نہیں گئی۔ اب اِدھر کی بھی سُدھ بُدھ لوں۔ اپنی قسمت میں تو تیمارداری ہی تیمارداری لکھی ہے!" اس نے نیم طنزیہ نیم سنجیدہ لہجہ میں کہا اور مجھ پر ایک آخری نظر ڈالتی ہوئی چلی گئی۔

دوسرے دن جب میں جاگا تو شنکر ایک گلدان میں لانبی لانبی ڈنڈیوں والے نرگسی پھول لگا رہا تھا۔ ان پھولوں کو دیکھ کر مجھے شونتی کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ دل عجب طرح سے دھڑکنے لگا میں نے شنکر سے پوچھا۔ "یہ پھول تم لائے ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا ــــ "رتنا لائی تھی"

"رتنا کون؟"

"شونتی کی بہن۔

یکایک مجھے رتنا یاد آ گئی جو ہو بہو شونتی سے ملتی تھی۔

"تو وہ اندر کیوں نہیں آئی؟"

"وہ کسی سے نہیں بولتی۔ بہت شرماتی ہے۔"

"بولتی کیوں نہیں؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس حادثہ کے بعد سے سہم گئی ہے۔ یا کوئی ڈر اس کے دل میں سما گیا ہے۔" شنکر نے سوچ سوچ کر کہا "اس وقت بیچاری کی عمر آٹھ یا نو سال کی تھی۔ اب تو بول بھی نہیں سکتی۔ نہ کسی سے ملنا جلنا ہے اس کا۔ بس اپنی پوجا پاٹھ میں مگن رہتی ہے۔"

شنکر نے گلدان میں پھول سجا کر میرے قریب تپائی پر رکھ دیئے۔ مجھے ایسے

محسوس ہوا جیسے ہزار آنکھوں سے شونتی مجھے دیکھ رہی ہے۔

"اس گلدان کو باہر لے جاؤ!"

شنکر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"یہ پھول مجھے پسند نہیں ہیں۔"

شنکر گلدان باہر لے گیا۔

مگر دوسرے دن پھر وہی پھول گلدان میں سجا رہا تھا۔

"اب کہاں سے آئے یہ پھول!"

"وہی رتنالائی تھی۔ اشارے سے بتا رہی تھی کہ بیمار بابو کے لئے ہیں۔"

"اس سے کہہ دیا ہوتا۔ مجھے یہ پھول پسند نہیں ہیں۔"

"میں نے کہا تھا۔" شنکر بولا۔ "مگر اشارے سے مجھے سمجھانے لگی۔ صاحب کو پسند نہیں ہیں تو کیا ہوا، مجھے تو پسند ہیں۔"

عجب خبطی لڑکی ہے۔! میں نے نسیم کو یہ بات بتائی تو وہ بولی "میرا خیال ہے، بہن کے اس خوفناک حادثے کے بعد سے اس لڑکی کا دماغ چل گیا ہے۔ مجھے تو کچھ باؤلی سی لگتی ہے۔ عورتوں سے کتراتی ہے۔ مردوں کو دیکھتے ہی بھاگ جاتی ہے۔ ساری دُنیا سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ خیر اس مندر کے ساتھ بیس بچیس بیگھے زمین ہے۔ بیچاری کی زندگی کسی نہ کسی طرح کٹ جائے گی۔

ہولے ہولے میں اچھا ہونے لگا۔ اب نسیم ہر روز آتی تھی۔ اور دن کا بیشتر حصہ میرے پاس صرف کرتی تھی۔ بے حد باتونی تھی۔ مگر دوسری عورتوں کی طرح بیحد پریکٹیکل بھی۔ نرسنگ کا کام تو ایسا سیکھ گئی تھی کہ میں اس کی مرضی کے خلاف ایک پتہ نہیں ہلا سکتا تھا۔ اور

یہ کہنا پڑے گا کہ اسے اپنا کام آتا ہے اور اگر وہ بروقت میری تیمارداری اور دوا دارو نہ کرتی تو اب تک میں ملک عدم سدھار چکا ہوتا۔

"تمھیں میرا نہیں میرے شوہر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جس کی اجازت کے بغیر میں یہاں نہیں آسکتی تھی۔"

"جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا تو سب سے پہلے محمود کا شکریہ ادا کرنے تمھارے ساتھ چلوں گا۔ ویسے ان کا حال کیا ہے؟"

"بس ویسا ہی ہے۔ وہی طبیعت کا مدوجزر ہے۔ خود ہی تو اصرار کر کے تمھارے پاس بھیجتے ہیں اور جب میں یہاں سے جاتی ہوں۔ تو اداس۔ برہم۔ غصے میں ڈوبے ہوئے جلی کٹی سُنانے لگتے ہیں۔ کبھی تو میں چُپ ہو جاتی ہوں کبھی میں بھی برس پڑتی ہوں۔ پھر رات رات بھر بڑے زور کا جھگڑا ہوتا ہے۔ صبح جب میں اِدھر آنے کے لئے انکار کرتی ہوں تو معافی مانگنے لگتے ہیں، انسانیت کا واسطہ دے کر خُدا ترسی کا سبق پڑھانے لگتے ہیں۔ اب کوئی کیا کہے ان سے؟ جوں جوں مرض بگڑتا جاتا ہے۔ ان کا مزاج بھی زیادہ سے زیادہ برہم ہوتا جاتا ہے۔

"اکرم کی کوئی اطلاع ملی؟"

نسیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ دیر تک مجھے گھورتی رہی۔ آخر کار بولی

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کیا؟"

"میں نے تو ابھی تک محمود کو بھی نہیں بتایا۔ مگر تمھیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"کیا معلوم ہو گیا؟"

"یہی اکرم کے بارے میں۔"

"مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔ میں نے یونہی تم سے پوچھ لیا۔"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ہم بالکل اکیلے ہیں۔ تو اس نے اپنی آواز کم کر کے نیچے سروں میں بڑی رازداری سے مجھ سے کہا "اکرم کے کئی خط میرے پاس آئے ہیں معلوم نہیں اس نے کیسے میرا پتہ دریافت کر لیا۔ وہ اب تک مجھے چاہتا ہے۔ اب تک اس نے شادی نہیں کی!"

نسیمہ کی آواز میں نسائی غرور اور فتح مندی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔

"میں نے یہ خط محمود سے چھپا لئے ہیں۔" نسیمہ نے اور بھی گہری رازداری سے مجھ سے کہا۔ "اسے بتانے سے کیا حاصل۔ طبیعت اور برہم ہوگی۔ چیخیں گے چلائیں گے۔ جھلائیں گے۔ بلاوجہ مجھ پر شبہ کریں گے۔ غصہ میں اپنا منہ نوچیں گے۔ یا برتن توڑیں گے، آدمی تو ہے نہیں اب وہ ..... وہ بڑی بے زاری سے بولی۔

"ہیئت کے ساتھ ساتھ روح بھی مسخ ہو چکی ہے۔ اس آدمی کو خود تو شدید اذیت حاصل ہے۔ لیکن جب تک وہ مجھے اس سے دوگنی اذیت نہ پہنچا لے اس وقت تک اسے چین نہیں آتا۔ محمود آدمی نہیں ہے۔ آدمی کے بھیس میں شیطان ہے۔"

"وہ ایک بیمار آدمی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "یہ کیسے بھول سکتی ہو کہ اتنی طویل شدید اور جان لیوا بیماری کے باوجود وہ آدمی اتنا اچھا دل رکھتا ہے کہ ایک بالکل غیر اور اجنبی آدمی کی تیمارداری کے لئے تمہیں یہاں بھیج دیتا ہے۔"

"اور اس کے بعد مجھے جو جلی کٹی سُننا پڑتی ہے نا؟" تم یوں کہتے ہو۔

نسیمہ جل کر بولی۔ "مجھے جلا کر خاک کر دیا ہے اس مردے نے؟"

نسیمہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

میں نے بڑی ہوشیاری سے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نسیمہ مسکرانے لگی۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے اسے سکاٹ لینڈ

کے لوگوں کی کنجوسی کے خلاف لطیفے سُنانے شروع کئے تو وہ قہقہے پر قہقہے لگانے لگی۔ وہ کنجوس لوگوں کے خلاف لطیفے سُننا بے حد پسند کرتی تھی۔ دن بھر ہم ساتھ رہے۔ اکٹھے لنچ کھایا۔ سہ پہر میں ندی کے کنارے گئے۔ میں آج اس قدر صحت مندی محسوس کر رہا تھا، کہ میں نے آج ہی نسیمہ کے گھر جا کر محمود کا شکریہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

نسیمہ آج بے حد خوش تھی۔ ایک عرصہ کے بعد اس کے اداس اور حسرت ناک چہرے پر مسرت کی سُرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں نوجوان لڑکیوں کی سی کھنک آ چکی تھی۔ میرے لطیفے سُنانے پر وہ بار بار میرا ہاتھ پکڑ کر ہنسی سے دوہری ہوتی ہوئی کہتی "خدا کے لئے بس کرو۔ اور مت سُناؤ۔ بس اور مت سُناؤ۔ اب مجھ سے ہنسا نہیں جاتا"..... چلتے چلتے میں نے گھاٹی کی گھاس پر پھیلے ہوئے بنفشے کے ایک پودے سے بنفشے کے پھولوں کا ایک گچھا توڑ کر نسیمہ کے بالوں میں لگا دیا۔ وہ ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ کیا اظہارِ عشق ہے؟"

"نہیں۔ اظہارِ عقیدت ہے!" میں نے عاجزی سے کہا۔

"بزدل ہندو!" وہ گرج کر بولی.....

مگر اس کی گرج بالکل مصنوعی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مسکرانے لگی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھاس کے آخری حصہ پر چڑھ آئی۔ اب ہم دونوں رچرڈز کاٹج کے سامنے کھڑے تھے۔

نسیمہ نے مجھ سے کہا۔ "آؤ پہلے چہروں کو سنجیدہ بنا لیں۔ رونی صورت اپنے آپ پر طاری کر لیں پھر اندر چلیں۔"

"کیا فضول باتیں کرتی ہو۔!"

"میرا جی چاہتا ہے اس گھر کو جلا کر خاک کر دوں۔"

نسیمہ دانت پیس کر بولی۔

پھر وہ چوبی گیٹ کھول کر اندر ہولی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ سرمئی بجری پر ہمارے قدم کی چاپ ایسے سُنائی دینے لگی جیسے ہم کانچ کے ٹکڑوں پر چل رہے ہوں۔

پورچ میں کوئی نہیں تھا۔ نوکر سب پیچھے کے نوکر خانے میں تھے۔ پورچ میں محمود کی آرام کرسی خالی تھی۔ قریب میں ایک تپائی پر محمود کا پائپ اور اس کا تمباکو کا پارچ رکھا ہوا تھا۔

"محمود ــــ!"

نسیمہ نے بشاش لہجے میں اپنے شوہر کو آواز دی۔ اور پورچ سے گزر کر اندر کے ہال میں چلی گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے داخل ہوا۔

ہال کمرے کی چوبی چھت سے لٹکتی ہوئی رسّی میں جھولتی ہوئی محمود کی لاش ہولے ہولے ہل رہی تھی۔

محمود نے غصّے میں اور شدید غیض و غضب کے عالم میں آکر خودکشی کرلی تھی۔ مرنے سے چند منٹ پہلے وہ اپنی بیوی نسیمہ کے لئے ایک خط لکھ کر چھوڑ گیا تھا۔ جس میں اس نے اپنی بیوی پر بیوفائی اور ظلم کا الزام لگایا تھا وہ ایک ہندو سے محبت کرتی تھی (یعنی مجھ سے) اور اگر اس ہندو سے محبت نہیں کرتی تھی تو اکرم سے محبت کرتی تھی۔ اور اگر اکرم سے بھی محبت نہیں کرتی تھی۔ تو کم سے کم اپنے شوہر سے تو بالکل محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک سستی بے حیا اور بے وفا عورت تھی۔ جس کے ظلم و ستم سے عاجز آکر محمود خودکشی کر رہا تھا۔

"اگر ہم چند منٹ پہلے آجاتے تو شاید محمود کو خودکشی سے روک لیتے۔ کیوں کہ باہر تپائی پر اس کا پائپ ابھی تک گرم تھا۔" تین چار دن کے بعد میں نے نسیمہ سے کہا۔

"کیسے پہلے آجاتے!" نسیمہ بھڑک کر بولی "تم مجھے لطیفے جو سُنا رہے تھے۔ اور میں تمھیں منع کر رہی تھی۔ مگر تم سُناتے چلے جا رہے تھے۔ احمق کنجوسوں کے لطیفے۔ تم نے دیر کر دی اور میرا شوہر بے چارا ــــ" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"وہ کئی برس سے تقریباً مُردہ چلا آرہا تھا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا "تم محض اس کی زندہ لاش کو گھسیٹ رہی تھیں۔"

"میں گھسیٹ رہی تھی۔ تم تو گھسیٹ نہیں رہے تھے۔" وہ خفا ہو کر بولی۔

"وہ تم پر تو کسی طرح کا بار نہ تھا۔؟" پھر؟ وہ مجھے ایسی غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے مجھے کچا کھا جائے گی۔ پھر رونگی ہو کر بولی۔ "ہمیشہ ہم مسلمانوں پر تم ہندوؤں کی وجہ سے مصیبت آتی ہے۔ نہ تم وادی میں آتے نہ میرا شوہر خودکشی کرتا۔ مگر ہمیں خود جاننا چاہیئے تھا کہ اس قوم سے فیض ممکن نہیں ہے۔ دیکھ لو۔" وہ رو کر بولی۔ "میں نے دن رات تمھاری تیمارداری کی اور تمھاری وجہ سے میرے شوہر کی جان گئی۔ آخر ہونا شیواجی کی اولاد۔۔۔۔۔۔"

"پہلی بات تو یہ ہے میڈم کہ میں شیواجی کی اولاد نہیں ہوں۔ دوسری بات یہ کہ محض ایک فرد یعنی شیواجی کو مغلیہ سلطنت کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانا کسی طرح درست نہیں۔ اتنی بڑی سلطنت کو کوئی ایک فرد ختم نہیں کر سکتا ان اسباب و عوامل کو اگر گہرے طریق سے جانچیں۔"

"میں اس سلسلے میں مزید کسی گہرے طریق کار سے جانچنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ آپ میرے گھر سے نکل جایئے۔"

"یہ دوسری مرتبہ ہے کہ میں آپ کے گھر سے نکالا جا رہا ہوں۔ میں جانے کے لئے تیار ہوں مگر جانے سے پہلے دو ایک سوالوں کے جواب چاہتا ہوں۔"

"پوچھئے، پوچھئے! جلدی پوچھئے اور دفع ہو جایئے۔" نسیمہ ایک چھوٹے سے رومال میں اپنی ناک سڑک کر بولی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا اب پروگرام کیا ہے؟ جس آرزو کی آپ خواہش مند تھیں۔ وہ غیر متوقع طور پر اتنی جلد آپ کو مل گئی۔ میرے خیال میں اب آپ اس وادی سے فوراً باہر اپنے وطن جانے کو بے قرار ہوں گی۔ تہذیب و تمدن کی سرزمین کو۔۔۔۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔" نسیمہ بے جھجک سر ہلا کر انکار کرنے لگی۔ "میں یہیں رہوں گی۔ اسی وادی کی مٹی میں میری مٹی دفن ہوگی۔ جہاں میرے شوہر کی لاش دفن ہے!"

"مگر تم تو اس سے نفرت کرتی تھیں۔"

"کون کہتا ہے؟ کس نے کہا آپ سے؟ میں اپنے شوہر سے شدید محبت کرتی تھی۔ محبت نہ کرتی تو کیا دس سال یوں ہی میں نے اس کی خدمت میں اس وادی میں گزار دیئے۔ میں نوجوان ــــ خوبصورت اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ چاہتی تو اس کینسر کے مرض کے بعد چٹکی میں اس سے طلاق لے سکتی تھی۔"

"تم اب بھی خوبصورت، نوجوان اور امیر گھرانے کی لڑکی ہونے کے علاوہ ایک امیر بیوہ بھی ہو۔ جس کے نام اس کا شوہر ساری جائداد چھوڑ گیا ہے!"

"مگر تمھیں اس سے ایک پیسہ نہیں ملے گا۔! تم ہو کس خیال میں!"

"میں اپنے لئے نہیں سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم اب جتنی جلدی اس منحوس وادی سے چلی جاؤ اچھا ہے۔ اپنے وطن میں جا کر اپنے گھر والوں میں رہ کر اس قسم کی زندگی گزاروں جو تمھیں شروع سے پسند رہی ہے ممکن ہے تمھیں وہاں اپنی پسند کا کوئی دوسرا شوہر مل جائے۔ اکرم بھی انتظار کر رہا ہے۔"

"میں کہیں جانے والی نہیں ہوں۔" نسیمہ اپنا پاؤں پٹک کر بولی۔ "میں یہیں رہوں گی۔ اور ساری زندگی اسی کاٹیج میں رہ کر کسی سے نہ مل کر اپنے آپ کو اس میں زندہ دفن کر دوں گی۔ محمود نے مجھ پر جو غلط الزام لگایا ہے۔ اسے میں اپنے خون سے دھو دوں گی۔"

"مگر اب اس اُجاڑ اور سُنسان، ویران اور جنگلی علاقہ میں تمھارا اپنے شوہر کے بغیر رہنا خطرہ سے خالی بھی نہیں ہے۔"

"میں کسی خطرے سے نہیں ڈرتی۔ بیس برس کے دو پرانے نوکر میرے ساتھ ہیں۔ میری آیا جس نے مجھے بچپن ہی سے ماں کی طرح پالا میرے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے کسی طرح کا ڈر یا خوف نہیں ہے یہاں۔ یہاں سب لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ کوئی منافق نہیں ہے یہاں تمھارے سوا۔" نسیمہ گرج کر بولی۔

"میں نے کیا منافقت کی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔ اندر سے مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اُوپر سے ظاہر کرتے ہو جیسے تم کچھ محسوس ہی نہیں کرتے۔ اگر محسوس نہیں کرتے تو اس دن بنفشے کے پھولوں کا گچھا کیوں دیا تھا؟" نسیمہ نے تیز لہجہ میں مجھ سے پوچھا۔

"وہ تو محض اپنی محسنہ کے لئے جس نے میری جان بچائی ایک طرح کا اظہارِ عقیدت تھا۔ اب تم اس میں بھی منافقت ڈھونڈھنے چلی ہو۔؟"

"ہاں ہاں میں تمہاری طرح منافق نہیں ہوں۔ نہ تمہاری طرح فلسفہ طراز ہوں۔ میں الجھنا نہیں جانتی ہوں۔ میں ایک سیدھی کھری مسلمان عورت ہوں۔ تم سے صاف صاف کہتی ہوں۔ کبھی ادھر کا رُخ مت کرنا۔ تمہاری وجہ سے میرے شوہر کی جان گئی میں تمہاری جان تو نہیں لے سکتی۔ مگر تمہیں کبھی اس گھر میں قدم رکھنے نہ دوں گی۔ بس چلے جاؤ۔"

نسیمہ اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ غصہ سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور وہ اُنگلی کے اشارے سے مجھے گیٹ دکھا رہی تھی۔

میں اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی اُنگلی ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی "اور دیکھو اگر تم پھر کبھی قلعے کے اندر سوئے تو میں خود وہاں آ کر تمہارا گلا گھونٹ دوں گی۔ سمجھ گئے نیچے کے ڈاک بنگلے میں تم رہو گے اور کبھی قلعہ کے اندر نہیں جاؤ گے؟"

"اب میرے مرنے جینے سے تمہیں کیا؟" میں نے چلتے چلتے اس سے کہا۔ "میرا ارادہ تو آج رات ہی سے قلعہ میں سونے کا ہے۔"

وہ تیزی سے اُچھل کر میرے سامنے آ رہی اور میرا راستہ روک کر بولی۔ "خبردار جو تم قلعے میں سوئے۔ ورنہ میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ اپنے نوکروں سے کہہ کر ابھی نوکر خانے میں بند کرا دوں گی!"۔

"ابھی تو تم مجھے گھر سے نکال رہی تھیں۔ ابھی اسی گھر میں بند کروا رہی ہو۔" میں نے احتجاج کیا۔

وہ بولی۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میں جو جی چاہے کر سکتی ہوں۔ تم کیا میرے شوہر ہو جو مجھ پر دھونس جماتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جس پر تمہارا اپنا شوہر ہی دھونس نہیں جما سکا اس پر میں کیا جماؤں گا۔"

"گیٹ آؤٹ!" وہ چلا کر بولی۔

میں چلا آیا۔

گیٹ سے باہر نکل کر دیکھا۔ وہ اب تک وہیں کھڑی تھی۔ جہاں سے اس نے مجھے گیٹ آؤٹ کہا تھا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو اس نے پھر غصہ سے مٹھی بند کر کے اپنا بازو میری طرف بڑے خطرناک طریقے سے ہلایا۔ میں جلدی سے چلا آیا۔

شیرنی اسی طرح بپھری کھڑی تھی۔

• •
•

اس رات میں واپس قلعے میں چلا گیا۔ نسیمہ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے خیال سے نہیں۔ اسے جلانے یا کُڑھانے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ قلعہ مجھے بلا رہا تھا۔ ہر لحظہ جب میں اس کی طرف دیکھتا وہ مجھے اپنی سمت بُلاتا ہوا معلوم دیتا۔ جیسے دیواریں اور کنگورے اور برجیاں اور ایک ایک کائی لگا پتھر اس پرانے قلعے کا اپنے نظر آنے والے ہاتھوں سے مجھے اشارہ کر کے بار بار بُلا رہا ہو۔ قلعہ جیسے میری غیر حاضری سے سوگوار ہو۔ اور عجب حسرت ناک انداز میں میری طرف دیکھتا ہوا مجھے اپنے اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو۔

جب میں اندر چلا گیا۔ اور جب قلعہ کا دروازہ باہر کی دُنیا پر بند ہو گیا تو مجھے ایسا لگا جیسے صرف میں نے نہیں پورے قلعہ نے آج ایک مدّت کے بعد اطمینان کا سانس لیا ہے۔ اس کے در و دیوار فرش اور چھتیں تک مجھے خوش آمدید کہہ رہی تھیں ہنستے کھیلتے

نوکروں چاکروں باندیوں سے غلام گردشیں بھری تھیں۔

وہ سب میری طرف خوش اور بشاشت سے دیکھ رہی تھیں۔ باندیاں اور مہریاں کمر مٹکاتی۔ پائل جھنکاتی، ترچھی نظروں کے بان مارتی چلی جا رہی تھیں۔ سارا قلعہ آج پھر سے آباد تھا۔

اس قلعہ میں ہمیشہ میں نے دو سطحوں پر دو مختلف غیر مرئی دُنیا میں آباد دیکھی ہیں۔ یا محسوس کی ہیں۔ ایک تو دُنیا راجپوتوں کے زمانے کی۔ مغلوں اور راجپوتوں کی آویزش اور آمیزش کی۔ دوسری دُنیا ایک عجیب ویرانے اور سناٹے کی۔ جس میں شونتی کے اُداس رُستے ہوئے چہرے کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اور جب میں چاہتا ہوں۔ جس طرح پر جو دُنیا آباد ہے۔ اسے اس قلعے میں دیکھ لیتا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے بہت کم نچلی سطح پر آباد دُنیا کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے ان غلاموں باندیوں اور مہریوں سے بھری ہوئی دُنیا سے زیادہ دلچسپی نہ رہی۔ شاید اگر شونتی کا چہرہ پہلے نظر نہ آجاتا تو ہوتی۔ مگر اب تو جوں ہی رات ہوتی ہے اور قلعہ آباد ہونے لگتا ہے۔ میں باندیوں۔ مہریوں۔ غلاموں۔ سپاہیوں اور سرداروں کی ٹولیوں سے بے خطر اُلجھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ میں ان سے ہم کلام ہونا بھی پسند نہیں کرتا میں تخلیہ چاہتا ہوں اور تنہائی اور سناٹا۔ اس لئے پہلی سطح کی غیر مرئی آباد دُنیا میرے حکم سے تحلیل ہو جاتی ہے اور سارا قلعہ چشم زدن میں ویران ہو جاتا ہے اور سانس روک کر شونتی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

کوئی دو بجے کے قریب وہ آئی۔ اب تو مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کب آتی ہے۔ آدھی رات سے پہلے کبھی نہیں آتی۔ جب تک آنکھوں میں نیند بھر نہ جائے کبھی نہیں آتی۔ جب تک احساس انتظار کرتے کرتے تھک کر سن نہ ہونے لگیں نہیں آتی۔ جب غنودگی کا غبار ساری فضا میں تحلیل ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور اندرونی جبلتیں ڈھیلی ہونے لگتی ہیں تو اس وقت وہ آتی ہے اور جب تک جسم، روح، ذہن اور منطق کو خلا میں معلق نہ کر دیں وہ نہیں آتی ہے۔

مگر آج تو میں نے اس کے آنے کے لئے پہلے ہی سے سب آسانیاں بہم پہنچا دی

تھیں۔ بتی گل کر دی تھی۔ بستر پر سیدھا لیٹ گیا تھا۔ سارا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ دماغ کو چھٹی دے دی تھی۔ آنکھیں اس کے انتظار میں تھک کر چور ہو چلی تھیں۔ میرے چاروں طرف تاریک دھندلکوں کے بھنور پڑنے لگے تھے۔ اس وقت وہ آئی۔

اور جب وہ آئی تو سب سے پہلے وہی کافوری خوشبو آئی اور دھیرے دھیرے میرے ہوش و حواس معطل ہوتے گئے اور اب میرا پلنگ فضا میں معلق تھا۔ اور میں اس پر سیدھا لیٹا تھا۔ اور وہ میرے اُوپر جھکی ہوئی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھے بھول گئے ہو لالی؟"

"نہیں شونتی۔"

"تم نسیمہ سے پیار کرتے ہو نا؟"

"نہیں شونتی۔"

"تو اتنے دن قلعہ میں کیوں نہیں آئے؟"

"کسی نے آنے نہیں دیا۔"

"میں ہر روز رات کو اس کمرے میں تمہارا انتظار کرتی تھی۔"

"میں بہت بیمار تھا شونتی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔"

"میں تو ہوش میں تھی اور ہر دم تم پر نگاہ رکھتی تھی۔ جب تلک تم یہاں رہے کبھی میری آنکھ سے اوجھل نہیں رہے۔ میں ہر دم تمہارے ساتھ رہی۔ تمہیں معلوم بھی نہیں ہوگا ایک پوری رات میں تمہاری پیٹھ سے لگی تمہارے بدن کی حرارت اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ مگر میرا تو کوئی بدن نہیں ہے۔ اس لئے میں تمہارے بخار کی حرارت اپنے اندر جذب نہیں کر سکی۔ نسیمہ ایسی زندہ عورتوں کے لئے عشق کرنا کتنا آسان ہے۔"

وہ مجھ سے عشق نہیں کرتی۔ نہ میں اس سے!"

"میں جانتی ہوں۔ پھر بھی یقین نہیں آتا۔"

"کیوں نہیں آتا۔؟"

"عورت مرکر بھی حسد ورقابت سے دور نہیں رہ سکتی۔ مجھے معلوم ہے۔ تم نسیمہ سے پیار نہیں کرتے ہو۔ پھر بھی میرے دل کے اندر شاید کوئی اور دل ہے۔ جو مجھے نسیمہ سے حسد کرنے پر اکساتا ہے۔ جو تمھیں طعنے دینے پر مجھے مجبور کرتا ہے۔ مگر اب میں زیادہ دن تمھارے ساتھ نہ رہ سکوں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میرے جانے کے دن آگئے۔"

"کہاں۔"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔"

"کب جاؤ گی؟"

"جس دن تم مجھے اس قلعہ سے آزاد کرو گے۔"

"تو میں زندگی بھر تمھیں آزاد نہیں کروں گا۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں زندگی بھر اس اکیلے ویران سنسان قلعے میں اکیلی پڑی سڑتی رہوں۔ میرا دم گھٹتا رہے۔ اور روح کچلی جاتی رہے۔ لالی مجھے آزاد کرو۔ آزاد کرو۔"

"کیسے شونتی۔؟"

"مجھے جلا دو! مجھے جلا دو!! مجھے جلا دو!!!"

اس کی آواز یکایک دور ہوتی گئی۔

کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گویا ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ پہلی غلام گردش سے دوسری غلام گردش میں پہنچ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

"مجھے جلا دو! مجھے جلا دو!! مجھے جلا دو!!!

لالی مجھے جلا دو۔ مجھے آزاد کر دو!"

اس نیم تاریک غلام گردش میں وہ اکیلی چلی جا رہی تھی۔ ایک سفید کافوری شمع کی طرح رُخ روشن لئے ہوئے وہ ان کانچ کی کھڑکیوں کی طرف سرکتی جا رہی تھی جو دوسری طرف ندی کے بہاؤ کی جانب قلعے کے باہر کھلتی تھیں پھر نیچے جانے والی تین سیڑھیاں آئیں اور یکایک مجھ سے بیس تیس گز کے فاصلے پر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے تاریکی میں آگے ہاتھ پیر مارے۔ مگر کچھ نہ تھا۔ کہیں پر کچھ نہ تھا۔ میرے سامنے قلعہ کے زنان خانے کا گرا ہوا ملبہ تھا۔ جس پر گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

"شونتی! شونتی!!"..... میں زور سے چلایا.....

غلام گردش میں میری آواز گونجی..... شونتی کو بار بار پکارتی چلی گئی جیسے باری باری فاصلے پر سپاہی شونتی کا نام لے کر پکار رہے ہوں۔ میں لوٹ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور اب کے مشعل لے کر باہر نکلا۔ پھر اس غلام گردش میں گیا۔ پھر اسی جگہ گیا جہاں شونتی غائب ہوئی تھی۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی کمرہ نہ دروازہ۔ پتھر، مٹی گارے اور چونے کا ملبہ پڑا تھا۔ اور اس پر جھاڑیاں اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔

پھر میں نے ایک ایک کر کے اس غلام گردش کی کانچ والی ساری کھڑکیاں کھول ڈالیں اور کھڑکیاں کھلتے ہی باہر کی ندیوں کا شور اندر آیا اور جنگل میں درختوں کی سائیں۔ سائیں اور تکلیف دہ سناٹے میں میں نے چیخ کر کہا۔

"شونتی! شونتی!! کہاں ہو تم؟ کہاں ہو؟"

میری پاگل آواز دور دور تک ہوا کے دوش پر ایک مایوس چمگادڑ کی طرح رات کے سناٹے میں چکر لگاتی ہوئی دوڑتی گئی اور تھک ہار کر وہیں باہر کسی پرانے درخت کی ٹہنی سے لٹک کر اُلٹی ہو گئی۔ اس دُنیا میں جتنی چمگادڑیں ہیں۔ ناکام عاشقوں کی آوازیں ہیں۔

پھر دور غلام گردش کے موڑ پر مجھے روشنی قریب آتی دکھائی دی۔ پہلے روشنی پر ایک

سایہ۔ پھر دونوں ساتھ ساتھ چلتے نظر آئے۔ قریب آئے تو دیکھا۔ یہ شنکر تھا اور ہاتھ میں لالٹین لئے چلا آرہا تھا۔

میں سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہا نہیں۔ اس نے بڑی مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور مجھے واپس میرے کمرے میں لے جا کر مجھے میرے بستر پر سلا دیا۔۔۔

٭

دوسرے دن لیکایک میرا ذہن صاف ہونے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اب تک میں اس معمے کے غلط کونے پر کھڑا تھا۔ دراصل مجھے اس سوال کو کسی دوسرے زاویئے سے حل کرنا ہوگا۔ بھوت کے پیچھے بھاگنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا مجھے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ شوتی کیسے مری تھی اور کہاں پر ماری گئی تھی۔ اور کون اس کے قاتل تھے؟ اس معمے کو حل کرنے کا ایک زاویہ یہ بھی ہو سکتا ہے جواب تک میری نظر سے اوجھل تھا۔

اور جب یہ زاویہ نگاہ میں آیا۔ تو سب سے پہلے میں نے رتنا کو انٹرویو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اسے مندر کے عقب میں ندی کے کنارے پھولوں کی جھاڑیوں میں تقریباً چھپے ہوئے پکڑ لیا۔

وہ ایک تھالی میں گلاب اور گیندے کے پھول رکھے ہوئے بھوانی ماتا کے لئے ہار پرو رہی تھی اور اس کے ہاتھ کی اُنگلیاں کافوری قلموں کی طرح لانبی اور مخروطی تھیں۔ اور آنکھیں اس طرح پر اسرار تھیں۔

میں قریب کی جھاڑیوں سے میری گولڈ کے پھول چُن چُن کر اسے دینے لگا۔

"کیا تم واقعی نہیں بول سکتی ہو؟"

"اس نے سر ہلا دیا۔ ناں میں!"

"کیا سچ مچ نہیں بول سکتی ہو۔ کہ بنتی ہو؟"

اس نے پھر غصّے سے انکار میں سر ہلا دیا۔

میں حیرت سے اس کے پاؤں دیکھنے لگا۔ وہی گلابی چرن کمل۔ حیرت انگیز طور پر خوب صورت۔ نازک چھوٹے اور پتلے۔

ایسے خوبصورت پاؤں میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھے۔

اس نے گھبرا کر دونوں پاؤں ندی میں ڈال دیئے۔

پانی میں اور بھی خوب صورت نظر آتے ہیں۔

اس نے پاؤں پانی سے نکال کر جلدی سے اپنی سفید ساری میں چھپا لئے۔

"مجھے بتاؤ کس نے تمہاری بہن کو مارا۔ جافر سن صاحب نے؟"

رتنا نے انکار میں سر ہلا دیا گویا کہہ رہی ہو "مجھے نہیں معلوم!"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"مجھے لگتا ہے۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ سچ مچ کہو تمہاری بہن کا قاتل کون ہے؟"

وہ میرے تیز و تند لہجہ سے گھبرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اس کا فق چہرہ پہلے سے بھی زیادہ فق ہو گیا۔ ہونٹوں کا رنگ تک اُڑ گیا۔ رخساروں کے گلاب سفید ہو گئے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تمہیں بتانا ہو گا۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

وہ میری طرف دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم ہاتھ چھڑا کے بھاگ گئی اور مندر کے اندر ایک عقبی دروازے سے غائب ہو گئی۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔ میں موڑ کاٹ کر مندر کے سامنے کے دروازے کی طرف

گیا۔ وہ بھی اس وقت اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ میں واپس ندی پر آ گیا۔ جہاں رتنا اپنی تھالی چھوڑ گئی تھی۔ جس میں بھوانی ماتا کے لئے پھولوں کا ہار آدھا پرویا ہوا پڑا تھا۔

میں نے تھالی سے ہار اُٹھایا اور اس میں پھول پرو کر آہستہ آہستہ اسے مکمل کرنے لگا۔ جب ہار قریب قریب مکمل ہو گیا تو مجھے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے رتنا کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پیچھے شونتی کھڑی ہے۔ مگر نہیں رتنا تھی۔ اس نے جلدی سے پوجا کی تھالی میرے ہاتھ سے لے لی اور میری گود میں کاغذ کا پُرزہ گرا دیا۔

میں نے پُرزہ کھول کر دیکھا۔ اس پر دیوناگری حروف میں صرف ایک نام لکھا تھا۔

"گوکل داس"

گوکل داس؟ میں نے غور سے پڑھا۔ گوکل داس کون ہے؟ اتنے دن سے اس گاؤں میں رہ رہا ہوں۔ گوکل داس نام کے کسی آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ گوکل داس کون ہے؟ میں نے گھوم کر رتنا سے سوال کرنا چاہا۔ مگر رتنا غائب ہو چکی تھی۔ میں نے مندر کا دروازہ بہت بار پیٹا۔ مگر رتنا نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں کاغذ کے اس پُرزے کو بڑی احتیاط سے لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال کر واپس چلا آیا۔

اس رات سونے سے پہلے میں نے شنکر سے پوچھا۔

"یہ ـــــ گوکل داس کون ہے؟"

شنکر اس وقت ایک ٹرے میں پانی کا جگ اور گلاس لے کر میرے کمرے میں پلنگ کے قریب بڑی تپائی پر رکھنے جا رہا تھا۔ یکایک وہ تپائی سے ٹکرا کر ٹھوکر کھا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ مگر ٹرے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ کانچ کا جگ اور کانچ کے دونوں گلاس ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

شنکر "ساری سزا" کہہ کر باہر گیا۔ جھاڑو لے کر آیا۔ بڑی احتیاط سے اس نے کانچ کے ایک ایک ریزے کو جھاڑو کے ذریعہ اٹھا کر کے ایک ٹوکری میں ڈال کے باہر لے گیا۔ واپس آیا تو ایک گیلا کپڑا لے کر فرش کو اچھی طرح سے صاف کرنے لگا۔ جب وہ فرش صاف کر رہا تھا تو میں نے اس سے پھر پوچھا۔

"یہ گوکل داس ــــ کون ہے؟"

اس نے ہاتھ روک کر کہا۔ "مجھے معلوم نہیں صاحب۔ اس گاؤں میں تو کوئی گوکل داس رہتا نہیں ہے۔ میں کسی گوکل داس کو نہیں جانتا۔ مگر آپ نمبردار سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

شنکر نے اپنا کام روز کی طرح بڑی احتیاط اور مشاقی سے کیا۔ میری علالت میں اس نے میری جو خدمت کی تھی۔ اس سے خوش ہو کر میں نے اسے آج بیس روپیہ انعام میں دیئے۔ انعام پا کر وہ تین دفعہ نیچے جھکا اور جھک کر کورنش بجالایا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں میں شنکر کو پسند کرنے لگا تھا۔ ایک تو باتونی نہ تھا۔ دوسرے وفادار تھا۔ تیسرے اس سے کچھ کہنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ خود بہ خود ہر بات کا خیال رکھتا تھا۔

شنکر نے قلعے کے اندر کی چابیوں کا گچھا مجھے دیا اور سلام کر کے رخصت ہوا روز کی طرح میں نے قلعہ کو چاروں طرف سے بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر پڑھنے لگا۔ لیکن آج مجھے بہت جلد نیند آ گئی۔ پتہ نہیں کیوں۔ لیکن آج میں شونتی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ آج وہ نہ آئے۔ آج میرا دل کسی اور سوچ میں گم تھا۔ جی چاہتا تھا جلد صبح ہو اور میں اپنے کام سے لگ جاؤں کچھ فیصلے میں نے بھی کئے تھے۔

مگر شونتی آ گئی۔ وہ آنے سے باز نہ رہ سکی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "جب تم آتی ہو تو یہ کیسی خوشبو ساتھ لاتی ہو اس سے میرے رگ و پے میں زہر دوڑنے لگتا ہے۔ جسم کا بند بند ٹوٹنے لگتا ہے۔"

"یہ سمے کی خوشبو ہے۔" شونتی گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اس کے بنا میں تمہارے

پاس نہیں آ سکتی۔ یہ گزرے ہوئے وقت کی خوشبو ہے۔ جو مستقبل میں جمع رہتی ہے۔ اگر کوئی نوٹ کے اِدھر آنا چاہے۔ جیسے میں تمہارے پاس آتی ہوں۔ تو، مجھے اس خوشبو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر میں تمہارے پاس نہیں آ سکتی۔"

"تو گویا تم میرے لئے اپنے مستقبل کو خرچ کر رہی ہو؟ کتنا خرچ کر چکی ہو؟"

"بس ایک رات باقی رہ گئی ہے۔" شونتی گہری اداسی سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "اپنے مستقبل کے سات سال دیتی ہوں تو ایک رات تمہاری جانب لوٹتی ہوں۔ اسی طرح میں نے اپنا سارا مستقبل خرچ کر ڈالا ہے اور بس اب ایک رات کے لئے اور تمہارے پاس آ سکتی ہوں۔"

اس نے ہوا کے لمس سے بھی زیادہ نازک انگلیوں سے میرے چہرے کو چھوا اور برف کے گالوں سے بھی شفاف ہونٹوں سے میری آنکھوں کو چوما اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے بستر پر نہیں گلاب کی دو پتیوں کے درمیان لیٹا ہوں۔ میں نے اس کی سسکی کی سرد آہ اپنے ماتھے پر محسوس کی .....

"شونتی .....!" میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"نہیں۔ آج تم نہیں بولو گے! آج مجھے کہنے دو.... انھوں نے مجھے محبت نہیں کرنے دی۔ انھوں نے میری عزت مجھ سے چھین لی۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ عورت کے لئے عزت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ عورت کے لئے جو کچھ ہے محبت ہے۔ اور اگر وہ محبت نہیں کر سکتی یا اسے محبت کا موقع نہیں دیا جاتا تو اس کی زندگی ادھوری اور نامکمل رہتی ہے۔ میں اپنے آپ کو مکمل کرنے کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔"

"کیسے مکمل کرو گی اپنے آپ کو؟ مجھ سے پریم کر کے؟"

"نہیں۔ اپنے آپ کو آزاد کر کے ..... میں اس قلعہ کی چہار دیواری میں محصور

ہوں ایک قیدی کی طرح بند کر دی گئی ہوں۔ اور قیدی محبت نہیں کر سکتے۔ محبت کرنے کے لئے آزاد ہونا ضروری ہے۔"

"آج تم ایک پنڈائن کی طرح باتیں کر رہی ہو۔"

"یہ مت بھولو۔ میں ایک پنڈت کی بیٹی ہوں۔ میں نے بہت کچھ پڑھا ہے، جو ہمارے گرنتھوں میں ہے۔ اور جو آج بھی بہت قیمتی ہے۔"

"اور اگر میں تمہیں آزاد کر دوں، جس کا کہ میں نے آج ہی فیصلہ کیا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ "تو تم تو پھر غالباً مجھ سے ملنے کے لئے نہ آؤ گی۔ ٹھیک بھی ہے... ایک آخری ملن کے لئے سارے مستقبل کو خرچ کر دینا بڑی حماقت ہے۔"

"تو تم عورت کو نہیں جانتے۔" شونتی نے سسک کر اپنے گال میرے گال سے لگا دیئے۔ اور اس کے گال کے آنسو ڈھلک کر میرے گال پر آ گرے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔ میں بہت دیر تک چپ رہا۔

"میں نے تمہیں آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یعنی میں تمہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔ اور بدلے میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک بار اپنی صورت اور دکھا دو حالاں کہ مجھے معلوم ہے کہ جو روح آزاد ہو جاتی ہے وہ پھر واپس نہیں آتی۔"

"میں واپس آؤں گی۔" شونتی پُر اعتماد لہجہ میں بولی۔ "میں ضرور واپس آؤں گی..... چاہے ایک پل کے لئے آؤں مگر آؤں گی ضرور۔"

میں نے اس کے ہونٹ اپنے ماتھے پر محسوس کئے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے دور ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے وہ خوشبو بھی جانے لگی۔ مگر آج میں نے اسے روکنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کب گئی۔ کدھر سے گئی۔ میں گہری نیند سو چکا تھا۔

دوسرے دن صبح شنکر نہیں آیا۔ ناشتہ کا وقت ہو گیا۔ جب بھی نہیں آیا میں کچھ حیران و پریشان ہو کر قلعہ سے باہر نکلا اور ابھی چوبی پل تک ہی گیا تھا کہ مجھے

شنکر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا۔ گاؤں کی جانب سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ آتے ہی اس نے مجھ سے معافی مانگی۔

"انڈے ختم ہو گئے تھے صاحب، مجھے خیال نہیں رہا۔ آج صبح جو نعمت خانہ دیکھا تو جلدی سے بھاگا گاؤں انڈے لانے کے لئے۔"

وہ ایک تھیلی میں بہت سے انڈے لئے چلا آ رہا تھا۔

غسل کر کے اور ناشتہ لے کر میں گاؤں کی طرف نکل گیا۔ سب سے پہلے میں نے نمبردار روی داس کو اس کے گھر کے آنگن میں جا پکڑا۔

"یہ گوکل داس کون ہے؟" میں نے اس سے براہِ راست سوال کیا۔

سوال ایسی تیزی سے جلدی میں ہوا تھا کہ روی داس اپنے ہوش و حواس درست نہ رکھ سکا۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے میں نے دیکھا وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر میں اسے اس کا موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

"گوکل داس" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں گوکل داس، اور بنومت تمہارے چہرے سے لگتا ہے کہ تم اسے جانتے ہو۔"

روی داس اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں صاحب میں کسی گوکل داس کو نہیں جانتا ہمارے گاؤں میں کوئی گوکل داس نہیں رہتا۔"

میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ مگر پہاڑی دیکھنے میں سادہ لوح ہوتے ہیں مگر اندر سے بہت چالاک بھی ہوتے ہیں وہ اپنا منہ تھوڑا سا کھولے ہوئے احمقوں کی طرح منہ موڑ کر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ مگر اب میں اس سے اس وقت کچھ مزید معلومات حاصل نہ کر سکتا تھا۔

پھر میں کچھ کہے بغیر اس کے گھر سے لوٹ آیا۔

پھر دوسرے کسانوں کے پاس گیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں سے پوچھا۔ وہ سب سر ہلا کر انکار کرتے تھے۔ ان میں سے کسی نے گوکل داس کو نہیں دیکھا تھا نہ وہ اسے جانتے تھے۔ نہ کسی ایسے شخص کی ہستی سے آگاہی رکھتے تھے۔ ایک گوپال داس تو تھا ان کے گاؤں میں مگر گوکل داس کوئی نہ تھا..... میرے دل میں شبہات بڑھنے لگے۔ کہیں رتنا نے مجھے چکر تو نہیں دیا تھا۔ اس کا مطلب کیا تھا۔ اگر گوکل داس اس گاؤں میں نہیں ہے۔ تو پھر کہاں ہے۔؟

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نسیم سے معلوم کرنے کے لئے رچرڈز کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔ جواب میرے راستے سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھی۔

نسیم کالج کے باغیچہ میں چیری کے شگوفوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کے نیچے بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ قریب کی تپائی پر چائے رکھی تھی۔ بار بار وہ ایک بہت بڑی بلی کی طرح ایک چھوٹے سے بسکٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنے دانتوں سے کاٹ لیتی۔ اور اسے بڑی نزاکت سے چبانے لگی۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

بہت بڑے بے شرم ہو۔ منع کرنے پر بھی آجاتے ہو۔"

"بہت خوش معلوم ہوتی ہو" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ ایک دم بھڑک اٹھی بولی۔ "تو تم کیا چاہتے ہو آگ میں جل کر ستی ہو جاؤں۔؟"

"باپ رے کتنے کمینے ہوتے ہیں یہ ہندو مرد، خود تو مرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ میں عورت کو بھی جل جانے کی تلقین کرتے ہیں۔"

"میں اس وقت تم سے بے کار کی بحث کرنے نہیں آیا۔"

تو کیا عشق کرنے آئے ہو؟ یہ چیل دیکھی ہے؟"

بھڑکے چھتے سے کون عشق کرے گا؟" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مادام میں تو صرف یہ معلوم کرنے آیا تھا۔ کہ تم گوکل داس نام کے کسی شخص کو جانتی ہو؟"

"نہیں" وہ ایک دم بڑے وثوق سے انکار کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن دوسرے لمحے ہی میں فوراً اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے چلا پڑی۔ ہاں... ہاں جانتی ہوں گوکل داس..... قلعے کے ڈاک بنگلہ کا نائب بیرا تھا۔ انگریزوں کے وقت میں تھا۔ مگر اب تو وہ یہاں نہیں رہتا۔ برسوں سے اسے کسی نے اس گاؤں میں نہیں دیکھا۔ کیوں جان محمد۔؟" نسیم نے رک کر اپنے بیرے سے پوچھا۔ جو اس وقت میرے لئے چائے کی ٹرے اٹھائے لا رہا تھا۔

"ہاں بیگم صاحب۔ وہ جافرسن صاحب کے واقعے کے بعد سے کسی نے اس گاؤں میں نہیں دیکھا۔" جان محمد ٹرے رکھ کر چلا گیا۔ نسیم چائے بنانے لگی۔

"تمہاری چائے میں کتنا زہر ڈالوں؟" وہ شکر کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہ تو ناگن کے زہر کی کوالٹی پر منحصر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ نسیم مسکرا پڑی بولی۔

"ہندوؤں نے اور کچھ نہیں تو مسلمانوں سے باتیں کرنا تو سیکھ لیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اور جو باتیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی ہو لے ہو لے سیکھ لیں گے۔"

اس نے مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا۔ "گوکل داس سے تمہیں کیا کام ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں شونتی کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ!" نسیم چمک کر بولی۔ "وہ چڑیل ابھی تک تمہارے پیچھے پڑی ہے؟"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھ لینا۔" وہ معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "ایک دن یہ چڑیل تمہاری جان لے لیگی۔ ایک دن تم بھی اپنے بستر پر مُردہ پائے جاؤ گے۔"

٭

چائے پی کر جب میں کالج سے باہر نکلا۔ تو مجھے لکڑی کے جنگلے کے باہر لوگن ویلیا کی بیل کے قریب اپنی کہنی ٹکائے ہوئے جان محمد باورچی مل گیا۔ مجھے دیکھ کر آگے بڑھا۔

"حضور آپ کو گوکل داس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں!"

میں نے اسے دس کا نوٹ دیا۔ جو اس نے جلدی سے اپنی اندر کی جیب میں غائب کر دیا۔

"وہ اس گاؤں میں نہیں رہتا ہے۔" جان محمد نے میرے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔ "وہ اس وادی کے آخری سرے پر۔" جان محمد نے اشارہ کر کے بتایا "سب سے الگ تھلگ اور اکیلا رہتا ہے۔ اور کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے۔"

"کام کیا کرتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ مگر اس کے گھر سے ملی ہوئی ایک پرانی پن چکی ہے۔ اس وادی کے آخری گھاٹی کے بالکل آخری سرے پر۔ مگر اب تو وہاں کوئی آٹا پسانے بھی نہیں جاتا۔ کیوں کہ یہ پن چکی ہمارے گاؤں سے کوئی آدھے دن کی مسافت پر ہے۔ اتنی دور کون جائے گا۔"

"کھیتی باڑی کرتا ہے۔"

"مکی کا ایک چھوٹا سا کھیت ہے اس کا مشکل سے ایک مہینے کی فصل ہوتی ہوگی

اس میں۔!"

"بال بچے ہیں اس کے!"

"میرے خیال میں تو اکیلا رہتا ہے وہاں۔"

"تم کیسے جانتے ہو۔"

"دو سال پہلے وادی میں ایک سیلاب آیا تھا۔ گاؤں کی پن چکی اس سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ اتفاق سے انھیں دنوں ہمارے ہاں آٹا ختم ہوگیا۔ میں نے روی داس نمبردار سے اپنی مشکل کا ذکر کیا۔ تو اس نے مجھے اس دور دراز پن چکی پر آٹا پسوانے کے لئے کہا۔"

"پن چکی کے مالک کا نام بتایا تھا۔"

"ہاں۔ کہا تھا۔ گوکل داس کی پن چکی سے پسوالاؤ۔ مگر یہ بھی خیال اس نے ظاہر کیا تھا کہ گوکل داس کسی سے ملتا جلتا نہیں ہے۔ میں گیا تھا تو اس کمبخت نے آٹا پیس کے بھی نہیں دیا۔ اس لئے مجھے یہ واقعہ پورا یاد ہے۔"

"تمھیں روی داس نے پن چکی کے مالک کا نام بتایا تھا۔" میں نے جان محمد سے پوچھا۔

"جی ہاں اس سے تو مجھے گوکل داس کا نام معلوم ہوا تھا۔"

"تو پھر روی داس نے مجھ سے غلط کیوں کہا۔" میں نے اپنے دل سے سوال کیا مگر جان محمد سے کچھ نہ کہا۔ میں سوچتا ہوا ڈھلوان سے نیچے گاؤں کی طرف مڑ گیا۔

راستہ تنگ تھا اور دونوں طرف اونچی اونچی گھاس اور جھاڑیاں تھیں اور تین بار چلتے چلتے مجھے احساس ہوا کہ جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ گھاس میں سرسراہٹ ہو رہی تھی یا کسی جھاڑیوں کے پیچھے مجھے کوئی سایہ سا حرکت کرتا نظر آیا۔ میں تیز چلتے چلتے اک دم رک کر جو ایک جھاڑی کے قریب گیا تو جلدی سے اس کے نیچے سے ایک سفید خرگوش ابھرا اور چھلانگ مار کر لمبی گھاس میں غائب ہوگیا.....

میرے فق چہرے پر اب مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ پھر بھی میں نے یہ بہتر سمجھا کہ گوکل داس سے اکیلے ملنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اسے اپنی تھری ناٹ تھری لیکر ملا جائے۔

میں نے شنکر سے بہانہ کر دیا کہ آج شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ اتنا کہہ کر میں نے اپنی تھری ناٹ تھری اُٹھائی۔ شکار کا دوسرا سامان اٹھایا اور اکیلا ہی اس سمت نکل پڑا۔ جدھر جان محمد نے مجھے بتایا تھا کہ گوکل داس کی پن چکی ہے۔

ادھر مجھے گھوم کر جانا پڑا۔ پہلے میں نے جنگلوں کا رُخ کیا کہ اگر کوئی دیکھتا بھی ہو۔ تو یہی سمجھے کہ صاحب شکار کو جا رہے ہیں۔ پھر وہاں سے گھوم کر یہی ایک گھاٹی کی اوٹ میں ہو گیا اور ندی کے کنارے چلتے چلتے ایک تکونی ڈھلوان پر پہنچا۔ جہاں سے ندی کا ایک حصہ ایک گہری دھار کی صورت میں ایک پرانی پن چکی کے اندر سے ہو کر گرتا تھا۔ اس پن چکی سے ملا ہوا مٹی کا ایک پرانا گھر تھا۔ جس کے عقب میں مکئی کا ایک کھیت تھا۔ جن کی باڑھ پر کاؤ کے سخت کھردرے اور سیاہی مائل سبز پتوں والے پیڑوں کی ایک گھنی قطار کھڑی تھی اور اس تکونی گھاٹی کے ہر طرف سورج مکھی پھولوں کے تختے اور کتان کی جھاڑیوں کی اُونچی اُونچی باڑھ کھڑی تھی۔ یہاں کی فضا میں ایک عجیب گیلی بساند سی بسی ہوئی تھی جو میرے اعصاب پر ایک عجیب سی بیزاری پیدا کرنے لگی تھی۔ میں نے تھری ناٹ تھری کو اچھی طرح تھام لیا اور ایک جگہ سے باڑھ کو توڑ کر سیدھا اندر گھس گیا۔ گھاس اور جھاڑیوں کو روندتا ہوا پن چکی کے اندر پہنچا۔ مگر پن چکی میں کوئی نہیں تھا۔ پتھر کے دونوں پاٹ ایک دوسرے پر کھڑے جامد و ساکت تھے۔ ان کے نیچے سے پانی ایک گرجدار شور کے ساتھ تیزی سے گرتا ہوا جھاگ اُڑاتا ہوا پن چکی کے باہر نکل رہا تھا۔

پن چکی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اسے ایک لمبے عرصہ سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ میں اس پن چکی کے اندر چاروں طرف گھوم کر ہوئے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں میری بیٹھ پن چکی کے پتھر کے پاٹوں کی طرف ہو گئی۔

اک دم میں خوف سے اچھلا۔ پتھر کے پاٹ اک دم خود بہ خود چلنے لگے تھے۔ گھوم کر جو دیکھتا ہوں تو چوڑے چوڑے مگوں، گہری آنکھوں اور گھنی ابروؤں والا ایک بھاری بدن کا کسان اپنے سینے پر ایک بھبتی قمیض پہنے ہوئے اور اس کے نیچے ایک موٹا سا پائجامہ پہنے کاندھے پر کمبل لئے کھڑا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بڑے بڑے دانتوں سے ہنس رہا تھا "صاحب اِدھر کدھر شکار کھیلنے آیا ہے۔؟" اس نے بھاری گونجدار آواز میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے تھری ناٹ تھری اس کی طرف گھمائی۔

"تم گوکل داس ہو؟"

وہ بڑی بے خوفی سے بولا۔ "ہوں"

"شونتی کے قتل میں تم نے حصہ لیا تھا؟"

یکایک اس کا جبڑا لٹکنے لگا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گہری آنکھوں میں خوف کی چمک پیدا ہوئی۔ پتلیاں تیزی سے گھوم کر ساکت ہو گئیں۔ وہ ہولے ہولے میری طرف بڑھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "تھری ناٹ تھری بھری ہوئی ہے۔ میں اس سے بالعموم ریچھ کا شکار کرتا ہوں۔ آج میں اسی سے تمہاری جان لوں گا"

میں نے شست باندھ لی۔ اس کی طرف....

گوکل داس آگے نہ بڑھ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

"مجھے معلوم تھا ایک دن ایسا ہو گا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "ایک دن میرا پاپ میرے سامنے آئے گا"

"تمہیں گولی مارنے سے پہلے میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ اس قتل میں اور کون شریک تھا۔ حالاں کہ میں سب جانتا ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے مگر میں تمہاری زبان سے پورا واقعہ سُننا چاہتا ہوں۔ اگر ٹھیک ٹھیک بتا دو گے تو شاید تمہاری جان نہ لوں۔ مگر وہیں

بیٹھے رہو۔ آگے گھسٹنے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ چالاکی سے آگے گھسٹ کر مجھ پر حملہ کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا اسے میں نے تاڑ لیا تھا۔ اور اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی اس حرکت کو میں نے بھی تاڑ لیا ہے۔ وہ مجھ سے تقریباً تگنا تگڑا تھا۔ اس لئے میں ہر لحظہ ہوشیار رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دیا۔ اور عاجزی اور خوشامد سے بھری ہوئی آواز میں گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"صاحب۔ معافی دو۔ میں گناہگار نہیں ہوں۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ میری جان مت لو۔ میں نے شونتی کو جان سے نہیں مارا ہے۔ میں صرف اسے لینے گیا تھا۔"

"تمہارے ساتھ اور کون تھا۔"

"روی داس۔"

"روی داس؟" میں اپنی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ہاں روی داس، گاؤں کا نمبردار اور پنڈت ہری داس کا بھائی خود رات کو قلعے سے میرے ساتھ گیا تھا۔ اسے پہلے تو جافرسن صاحب نے بہت ڈرایا اور دھمکایا تھا کہا تھا وہ اس کی نمبرداری ضبط کرلے گا پھر اسے پھسلایا اور پچکارا تھا۔ اسے آس پاس کے سات گاؤں کا سرپنچ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ آخیر میں اسے چار سو روپے نقد دیئے تھے۔

"تمہیں کتنے ملے تھے۔"

"مجھے تیس روپے ملے تھے صاحب۔ میرا کام تو خالی شونتی کو اس کے گھر سے اٹھا کر قلعہ کے اندر پہنچانا تھا۔ خود پنڈت روی داس میرے ساتھ گیا تھا۔

"پھر کیا ہوا پورا واقعہ بیان کرو۔"

"اس وقت پنڈت ہری داس اپنے گھر کے اندر سو رہا تھا۔ جب ہم اس کے دروازے پر پہنچے۔ جب ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ اندر سے بولا "کون ہے" روی داس نے کہا میں ہوں تمہارا بھائی دروازہ کھولو۔ جوں ہی پنڈت ہری داس نے دروازہ کھولا میں

نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے گرا لیا اور رسّی سے جکڑ کر ایک کونے میں پھینک دیا۔ ایسی ہوشیاری اور پھرتی سے میں نے یہ کام کیا کہ ہری داس کے مُنہ سے چیخ تک نہ نکل سکی پھر روی داس نے مجھ سے کہا۔ اندر جا کے شونتی کو اٹھالو اور اتنا کہہ کر خود غائب ہو گیا۔ میں اندر گیا۔ دونوں بہنیں ساتھ ساتھ ایک کھاٹ پر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے سو رہی تھیں میں نے جب شونتی کو اٹھایا تو اس وقت رتنا بھی جاگ پڑی اور زور سے چیخی۔ میں نے شونتی کے مُنہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر گھر سے باہر لانے لگا۔ تو رتنا مجھ سے بھڑ گئی۔ مزاحمت کرنے لگی۔ چیخنے چلّانے لگی۔ میں نے ایک ہاتھ سے تو شونتی کو پکڑے رکھا اور دوسرے سے رتنا کو بھی کس لیا اور زور سے ایک گھونسہ مار کر اسے کھاٹ پر گرا دیا۔ آٹھ سال کی بچی ہی تو تھی۔ میرا ایک گھونسہ کھاتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ پھر میں شونتی کو اٹھا کر قلعے کے اندر لے آیا۔ صاحب بہادر بہت خوش ہوئے۔ مجھے تیس روپیہ انعام میں دیئے۔ بولے "تم ادھر ہی بیٹھو اس چھوکری کو واپس گھر پہنچا کر آنا۔"

"پھر کیا ہوا"

گوکل داس ایک دم چُپ ہو گیا۔ اس کا چہرہ ایک دم تن گیا تھا۔ اس کے کان باہر لگے ہوئے تھے۔ واقعی باہر کے کھیت میں آہٹ ہو رہی تھی گوکل کا چہرہ فق ہو گیا اس نے آہستہ سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دیکھنے کے لئے دبے قدموں سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ آہٹ خود بہ خود بند ہو گئی۔ پتہ نہیں قدموں کی آہٹ تھی۔ کہ کسی جنگلی جانور کی کہ پتوں کی سرسراہٹ تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ خود بہ خود بند ہو گئی۔ اور پھر پن چکی کے اندر گہرا سناٹا چھا گیا۔

دس منٹ گزر گئے۔ بیس منٹ گزر گئے۔ تیس منٹ گزر گئے۔

گوکل داس واپس نہیں آیا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا اس نے مجھے دھوکہ دیا تھا۔

کس صفائی سے۔ ایک ذرا سی چالاک نفسیاتی حرکت کو کام میں لا کر وہ فرار ہو گیا تھا۔ کون کہتا ہے کہ کسان لوگ بے وقوف ہوتے ہیں یہ تو شہریوں کے بھی کان کترتے ہیں۔ میں نے اپنی حماقت پر اپنا ماتھا پیٹا۔ جس نے جال میں گرفتار قاتل کو یوں نکل جانے کا موقع دیا۔

عقاب کیا ہو سکتا تھا۔ میں پن چکی سے باہر نکلا۔ ساتھ میں لگا ہوا اس کا گھر تھا۔ بڑی احتیاط سے اس کے گھر کے دروازے تک گیا۔ دروازے کو ذرا سی جنبش دی چیں چیں کی آواز پیدا کرتا ہوا، کواڑ خود بہ خود کھل گیا۔ گھر کے اندر ایک ہی کمرہ تھا۔ اور ایک چھوٹا سا صحن۔ کمرے میں ایک طرف چولہا تھا۔ ایک طرف ایک کھٹیا۔ مٹی کا ایک گھڑا اور چند مٹی کے برتن۔ دیوار پر ایک میلی کچیلی روئی دار جیکٹ لکڑی کی ایک کیل سے ٹنگی لٹک رہی تھی۔ مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں دبے پاؤں گھر سے باہر نکلا اور تھری ناٹ تھری ہاتھ میں لئے ساتھ کے کھیت میں اسے ڈھونڈھنے لگا۔ لمبی لمبی گھاس۔ اُونچی اونچی جھاڑیاں کاؤ کے درختوں کی گھنی قطاریں سب دیکھ ڈالی۔ گوکل داس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ تینوں طرف چکر کاٹ کر چوتھی طرف چلا جدھر ندی کا ایک حصہ کٹ کر پن چکی میں داخل ہو کر بڑی تیزی سے ایک ڈھلوان پر بہتا تھا۔ پانی کے کنارے چلتے چلتے جب میں پن چکی کی دیوار کے قریب پہنچا تو میں نے گوکل داس کو یکا یک دیکھ لیا۔

وہ پانی کے کنارے اکڑوں لیٹا تھا۔ اس کے پاؤں کنارے کی گھاس پر پھیلے ہوئے تھے اور سر پانی کے اندر تھا۔

میں نے اس کا سر اٹھا کر دیکھا۔ کسی نے پیچھے سے اس کے سر پر کسی کند آلے سے وار کیا تھا۔ سر پھٹ گیا تھا۔ موت فوراً واقعہ ہوئی تھی۔ ندی کے بہاؤ میں اس کا خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا سر پھر اس طرح پانی میں ڈال دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دور افق کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف سے گہرے اودے اودے بادل منڈلاتے ہوئے وادی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے فوراً چل دینا چاہیے۔

بہت احتیاط سے چلتا ہوا میں قلعہ کی جانب آیا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ ایک نہیں دو آدمی ہیں۔ شائد کئی آدمی ہیں یا تو ان کی زندگی رہے گی یا میری ایسا میں بھی محسوس کر سکتا تھا اس لئے میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آرہا تھا۔ یہ تو بالکل طے ہو چکا تھا کہ جو کوئی بھی میرا تعاقب کرنے والا ہے اس کے پاس بندوق نہیں ہے۔ ورنہ اب تک کئی ایسے مقام آئے تھے جہاں سے وہ مجھے بڑی آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس خیال نے مجھے راستہ میں بڑی ڈھارس دی۔ پھر بھی میں بے حد چوکنا تھا۔ کئی جگہوں پر جب راستہ بے حد تنگ ملا اور دو رویہ اونچی چٹانوں سے گھرا ہوا تھا۔ جہاں کہیں بھی بڑے پتھر کو لڑھکا کر مجھے ختم کیا جا سکتا تھا میں نے گھوم کر چکر کاٹا اور اس راستہ سے بچ کر چلا۔ مگر بہت تیزی سے چلا۔ میں دراصل روشنی کے ختم ہونے سے پہلے قلعہ کے اندر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

آج میرا مقابلہ بہت سے دشمنوں سے تھا۔ ایک تو وہ دشمن تھا جو شائد میرے تعاقب میں تھا جس نے گوکل داس کو بڑی چالاکی سے ختم کیا تھا۔ گوکل داس اب اس کے خلاف کوئی بیان نہیں دے سکتا تھا۔ دوسرا روی داس تھا۔ جس نے روپیہ لے کر اپنے بھائی کی بیٹی کی عصمت بیچ دی تھی۔ اور جسے میں گوکل داس کا نام لے کر خبردار کر چکا تھا پورا قصہ تو میں نے سُنا نہیں ممکن ہے آگے چل کر روی داس ہی شونتی کا قاتل ثابت ہو۔ یا کوئی اور؟ جس طرح گاؤں کے بہت سے لوگوں نے گوکل داس کا نام سن کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب لوگ کسی سے خائف ہیں یا نمبردار کے پٹھو ہیں اور اس کا نام لینا نہیں چاہتے بہر حال وہ جو کوئی بھی ہے۔ ایک یا دو یا دس۔ انھیں آج رات کھل کر میرے سامنے آجانا چاہیے۔

بادل گھر کر بڑھتے چلے آرہے تھے۔ روشنی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ بادلوں کی گرج اور چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ زور کا جھکڑ چلنے لگا۔

پھر ایک دم سے بارش کے تھپیڑے میرے چہرے پر طمانچے مارنے لگے۔ اور میں تیز تیز قدموں سے قلعہ کی طرف دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے انتہائی تیز رفتاری سے ایک ٹیلے کے نیچے سے گزر گیا۔ اور نکل کر ایک دم ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا چند ثانیوں کے بعد زور سے گڑگڑاتا ہوا ایک بہت بڑا پتھر ٹیلے کی چوٹی سے گرتا ہوا نیچے تک آیا اور ندی کے پانیوں میں شور مچاتا ہوا گر گیا۔ بس حملہ آور سے چند ثانیوں ہی کی دیر ہوئی تھی۔ نشانہ چوک گیا ورنہ موت یقینی تھی۔

میں دانت پیس کر سرپٹ بھاگا۔ اندھیرا دم بدم بڑھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد پانی میں شرابور مگر صحیح وسلامت قلعہ کے قریب والی چوبی پل پر پہنچ گیا جہاں شنکر گیلے کپڑوں میں تر بتر ایک لانبے فوجی اوور کوٹ کے لبادے میں ایک لالٹین کو اس کی اوٹ میں رکھے میرے انتظار میں کانپتا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے میرے گیلے کپڑے اُتار کر نچوڑ کر سکھانے کے لئے ایک الگنی پر ڈال دے۔ مجھے گرم پانی سے غسل دیا۔ برانڈی کا ایک بڑا پیگ دیا پھر دوسرا دیا۔ پھر عمدہ ڈنر دیا۔ پھر نیچے کے ڈاک بنگلے سے ایک عمدہ لحاف لا کے دیا۔ کیوں کہ سردی یکایک بڑھ گئی تھی اور دانت کٹکٹا رہے تھے اور اس طوفان میں دو کمبل کافی نہیں تھے رات کو سردی کو روکنے کے لئے ایک اور لحاف کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"آپ سو جایئے۔ آج میں رات بھر جاگ کر آپ کی نگہبانی کروں گا۔ آپ کو سردی لگ گئی ہے۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ آج تو قتل کی رات تھی آج تو وہ آنے والا تھا جس سے مجھے شونتی کے قتل کا انتقام لینا تھا۔ اب اس کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا۔ آج اسے اپنے آپ کو خود مجھ پر ظاہر کر دینا چاہیئے۔

اس لئے میں نے شنکر کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اسے بدستور سابق قلعہ سے باہر بھیج دیا۔ قلعہ کے سارے دروازے بند کر لئے اندر سے سوائے ایک نوکر خانے کے

راستے کے کوئی راستہ کو رکھنا چاہیئے اس کے لئے اندر آنے کے لئے۔ حالاں کہ یہ آسانی بے کار تھی۔ وہ کوئی راستہ نکال ہی لے گا اندر آنے کا۔ اس لئے سوچ کر میں نے نوکر خانے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ ممکن ہے اسے یہ دروازہ کھلا دیکھ کر ہی شُبہ ہو جائے اور وہ خبردار ہو جائے۔

سب دروازے بند کر کے اور سارے تالے اچھی طرح ہلا کر سب کنڈیاں، چٹخنیاں دیکھ کر میں اپنے کمرہ کے اندر محصور ہو گیا۔ کچھ دیر تک پڑھتا رہا۔ پھر بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

مگر بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ اور میں سونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ آج رات بھر جاگنا چاہتا تھا۔ مگر نیند تھی کہ آئے چلی جا رہی تھی۔ شاید یہ برانڈی کے پیگ کا اثر تھا اگر جاگنا ہی تھا تو برانڈی کا استعمال غلط رہا۔ لیکن سردی اس قدر بڑھ چکی تھی اور میں بارش میں اس قدر بھیگ چکا تھا کہ برانڈی لئے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

معلوم نہیں جاگتے جاگتے میں کب سو گیا۔ یکایک میرے جسم کے اندر کوئی الارم بجا اور میں یک لخت جاگ کر چوکنا ہو گیا۔ باہر بادل کی گرج اور چمک ہو رہی تھی بارش برسنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ مگر میرے احساس ان آوازوں کو ایک پس منظر کی طرح جذب کر رہے تھے۔ ان آوازوں سے اوپر جو آواز اُبھر رہی تھی وہ کسی کے رُک رُک کر سانس لینے کی آواز تھی جو حالاں کہ سب آوازوں سے کم تھی مگر اس وقت وہی سب سے اوپر اُبھر رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے کمرہ میں کوئی داخل ہو چکا ہے۔

❖

چند لمحے تو سکتے کے عالم میں گزرے۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا کسی کے قدموں کی چاپ بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ ٹھیک سے کس کی سانس کی آمد و رفت کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ مگر میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی جو مجھ سے کہہ رہی تھی۔ کہ کوئی تمہارے کمرے میں داخل ہو چکا ہے اور دھیرے دھیرے تمہارے بستر کی طرف بڑھ رہا ہے۔

کسی طرح کی آہٹ کئے بغیر میں بے حد احتیاط سے کروٹ لئے بغیر اسی طرح سیدھا لیٹا لیٹا پائینتی کی طرف کھسکنے لگا۔ انچوں کے حساب سے ہولے ہولے اسی حساب سے جس سے وہ میرے بستر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب آدھا بستر میرے جسم سے خالی ہو چکا تھا۔ میرا پورا جسم پائینتی میں پہنچ چکا تھا۔ لیکن پائینتی سے کھسکائے بغیر بستر سے اُترنا میرے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

دھیرے دھیرے میں اپنی سکڑی ہوئی ٹانگوں کو پائینتی سے نیچے فرش کی طرف پھیلانے لگا۔ بہت ہی دھیرے دھیرے اور لیٹے لیٹے جمنیزیم کی سی ورزش کرتے ہوئے بے آواز طریقے سے اپنی ٹانگیں پھیلا کر میں نے فرش تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں مجھے پسینہ آگیا۔ مگر میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میرے پاؤں فرش سے لگ گئے۔ پھر میں اور بھی گھسٹتا گھسٹتا نیچے پہنچتا گیا۔ مشکل کام سب سے یہ تھا

کہ آواز پیدا نہ ہو مجھے معلوم تھا کہ آواز پیدا ہوتے ہی وہ خبردار ہو جائے گا۔

اب میں فرش پر پہنچ چکا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا میرے سرہانے پہنچ چکا تھا۔ یکایک میں اپنے سرہانے پر اندھیرے کو ایک مٹھی کی طرح بند ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنی سانس کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اتنے قریب سے میں اس کی سانس کی آواز سن سکتا تھا۔

میں ہولے سے کوئی آواز پیدا کئے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا۔

وہ بڑی تیزی سے بستر کی طرف جھپٹا۔ عین اس وقت میں اس پر پیچھے سے کود پڑا۔ اس کے گلے سے حیرت کی ایک دبی سی چیخ نکلی۔ میں نے اسے اپنی دونوں بانہوں میں دبا لیا۔ مگر وہ بے حد موٹا اور تگڑا آدمی تھا۔ اس نے اپنے آپ کو جدوجہد کر کے مجھ سے چھڑا لیا۔ اور الٹا مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے۔ میری تھری ناٹ تھری کو ٹٹول کر ہاتھ میں لینے کی کوشش کی مجھے معلوم تھا وہ کہاں پڑی ہے۔ میں نے آنکھ بند کر کے اندھیرے میں لات چلائی۔ تھری ناٹ تھری ہم دونوں کی دسترس سے دور فرش پر کھڑکھڑاتی ہوئی کہیں جا پڑی۔

اب ہم دونوں گتھم گتھا تھے اور اندھیرے میں ایک دوسرے کو لاتیں اور گھونسے مار رہے تھے اور زور لگا کر ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی وہ اُوپر آتا کبھی میں۔ مگر وہ مجھ سے تگڑا تھا۔ ایک بار کوشش کر کے اس نے مجھے اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اور بستر کی پٹی سے میرا سر دے مارنے لگا۔ ایک بار، دو بار، تیسری بار۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی اڑنے لگیں، شراروں کے بھنور گھومنے لگے۔ معلوم ہوا کہ اگر تین بار اور اس نے اسی طرح میرا سر پٹی سے مارا تو میرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔ انتہائی کوشش کر کے میں نے ایک بازو اس کی گرفت سے نکال لیا اور پورے جسم کا پورا زور لگا کر ایک گھونسہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے اس سختی سے دیا کہ وہ اچھل کر ٹیڑھا ہو گیا۔ اور میری ایک ٹانگ اس

کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ میں نے دھڑ کی پوری طاقت سے اپنی ٹانگ اس کے پیٹ میں ماری اور وہ پھر دھرا ہو کر پلنگ پر گرا۔ اور میں اسی جھٹکے میں پلنگ سے باہر گرا۔ وہ گرتے ہی اٹھا۔ اس آخری جھٹکے میں پلنگ بھی ٹوٹ گیا۔ اور ایک زوردار چٹاخے سے اس کی پٹی ٹوٹ گئی۔ میں نے لات مار کر پلنگ کو اُلٹا کر دیا۔ اب وہ غالباً پلنگ کے اندر اُلٹا پھنسا ہوا نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے جلدی سے ٹٹول کر ٹارچ ڈھونڈی جو تپائی سے گر کر فرش پر لڑھک چکی تھی۔ ٹارچ ڈھونڈھ کر میں نے سب سے پہلے تھری ناٹ تھری کو اپنے قبضے میں لینا چاہا۔ جب تھری ناٹ تھری مجھے مل گئی تو اسے ہاتھ میں لے کر میں پلنگ کی طرف بڑھا۔ مگر اب تک وہ ٹوٹے ہوئے پائے سے نکل کر غسل خانے کے اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائی تو مجھے ایک آدمی بھاگتا ہوا چھلاوے کی طرح چھلانگ کر ساتھ والے کمرے میں جاتا ہوا معلوم ہوا۔ جس کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا۔ ٹارچ کو وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے دوڑا۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اب میرے ہاتھ میں تھری ناٹ تھری تھی۔ اور بھری ہوئی تھی۔ غالباً اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ کیوں کہ وہ بھی سایہ کی طرح دوسرے کمرے سے باہر نکل گیا اور غلام گردش میں دوڑتے ہوئے موڑ کاٹ کر غائب ہوگیا۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے اس کے پیچھے دوڑا اور موڑ کاٹ کر اس کو جا لیا۔

اب وہ دوسری غلام گردش میں دوڑ رہا تھا۔ جس کی کانچ کی رنگین کھڑکیاں نیچے کھائی میں کھلتی تھیں۔ جہاں ندی کا گہرا پانی قلعہ کے چاروں طرف آبی خندق بناتا ہوا گزرتا تھا۔

"ٹھیرو ٹھیرو..... رک جاؤ" میں نے چلا کر کہا "ورنہ گولی مار دوں گا۔" مگر وہ رُکا نہیں ایک چھلانگ مار کر اس نے اپنے جسم کی پوری طاقت سے کانچ کی ایک کھڑکی کو توڑ دیا۔ اس کا ارادہ اس کانچ کی کھڑکی کو توڑ کر نیچے بہتی ہوئی ندی میں کود جانے کا تھا۔ مگر میں نے بھی اس وقت گولی چلائی۔ کانچ کی کھڑکی زور کے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ اس کا سارا جسم باہر چلا گیا

مگر ایک اونی جیکٹ کھڑکی کے ایک ٹوٹے ہوئے کھونچے میں پھنسا ہوا رہ گیا۔ ایک ہاتھ اس کا کھڑکی پر تھا۔ جس میں گولی لگی تھی اور وہ باہر ہوا میں جھول رہا تھا۔ نیچے گہری خندق تھی۔ میں نے بھاگ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

اس کے سانس چلنے کی آواز زور زور سے آئی۔

پھر ایک غضب ناک گرج بجلی دور دور تک کوند گئی۔

میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ یہ شنکر تھا۔

"مجھے بچالو صاحب..... مجھے بچالو....." وہ گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"شونتی کی لاش کہاں دفن ہے۔" میں نے اس سے پوچھا۔

"جہاں آپ سوتے ہیں۔ اس کے نیچے پینٹری ہے ہال کے پیچھے اس میں گاڑ رکھی ہے۔"

"کس نے گاڑی تھی۔"

"میں نے نگرجا فرسن صاحب کے حکم سے۔ صاحب مجھے بچالو۔ مجھے اوپر کھینچ لو۔ صاحب میں سب بتاتا ہوں۔"

اس کا جسم ہوا میں جھول رہا تھا۔ ہوا میں اور طوفان میں اور بارش میں۔ اور اس کی بانہہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اور میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

"صاحب میرے ہاتھ چھوڑنا نہیں۔" وہ گڑگڑا کر کہنے لگا۔ ہاتھوں کو چھوڑنا نہیں صاحب نہیں تو میں مر جاؤں گا۔" اس نے نیچے کنکھیوں سے گہری کھائی کی طرف دیکھا اور اس کا سارا جسم لرز گیا۔

"نہیں چھوڑوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ مگر سچ سچ بتاؤ شونتی کو کس نے مارا۔"

"میں نے مارا صاحب۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔"

"کیوں؟"

"بہت شور مچاتی تھی جب صاحب اس کو اپنے کمرے میں لے گئے اور پھر جب اس کو واپس لے کر آئے۔ تو اس کے سارے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اور وہ خون میں تر بتر تھی پھر بھی وہ چیختی تھی اور چلاتی تھی اور سارے گاؤں کو خبر کرنے کی دھمکی دیتی تھی۔ وہ غصے میں بالکل پاگل ہو چکی تھی۔ اور جافرسن صاحب نے کہا۔ اس کو اسی وقت ختم کر کے اس کی لاش اس قلعہ میں گاڑ دو۔ ایسا جافرسن صاحب نے کہا صاحب۔"

یکایک میں نے اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اور مایوسی کی ایک تیز چیخ اس کے گلے سے نکلی۔ جو ایک شرارے کی طرح فضا میں ڈوبتی ہوئی نیچے کھائی میں کہیں گم ہو گئی۔ اس کا جسم پانی میں نہیں گرا کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

پھر عین اس وقت اتنی زور کی بجلی چمکی اور ایسی رعد کی آواز پیدا ہوئی جیسے لاکھوں توپیں ایک ساتھ چل گئی ہوں۔

سارا قلعہ جیسے کسی بھونچال سے کانپ گیا اور اس غلام گردش کے سامنے پڑا ہوا چٹانوں اور پتھروں اور گارے مٹی چونے کا ملبہ ٹوٹ ٹوٹ کر غلام گردش میں آنے لگا۔ میں تیزی سے بھاگ کر دوسرے گول کمرے میں چلا گیا۔

طوفان اس وقت پورے عروج پر تھا۔ رہ رہ کر بجلی کوندتی تھی۔ بارش کے تھپیڑے آتے تھے اور دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ جاتے تھے اس گول کمرے میں سے باہر کی ساری وادی دکھائی دیتی تھی۔ جب چند لمحوں کے لئے کوند لپکتا تو ساری وادی کو منور کر جاتا۔ پھر تاریکی میں گویا لاکھوں توپیں چلنے لگتیں۔ اس چند لمحوں کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ بجلی گاؤں کے ایک گھر پر گری اور اس میں آگ لگ گئی۔

☆

اگلے تین چار دن میں سب قصہ ختم ہو گیا۔ میں نے گاؤں سے تیراہ تک ایک آدمی بھیج کر پولیس کو طلب کر لیا۔ اور سارے گاؤں کو بلوا کر سب کے سامنے پولیس نے پینٹری کا فرش کھدوایا۔ جس میں سے ایک لڑکی کے ہڈیوں کا ڈھانچہ برآمد ہوا جسے مناسب رسوم کے ساتھ اسی دن ندی کے کنارے نذر آتش کر دیا گیا۔

پولیس نے شنکر کی لاش بھی اپنے قبضے میں کر لی۔ اور اس سلسلے میں میرے اور دوسرے لوگوں کے بیانات بھی قلم بند کر کے لے گئی۔ گاؤں والوں کو میری بات کا یقین کبھی نہ آتا۔ اگر قضائے قدرت سے روی داس کا گھر نہ جلتا۔ وہ کھاٹ پر پڑا سو رہا تھا جب بجلی اس کی کھاٹ پر پڑی اور اس کے جسم کو آن واحد میں سوختہ کر گئی۔ اس کے قریب ہی اس کے بیوی اور بچے سو رہے تھے۔ لیکن وہ سب بچ گئے۔ کچھ لوگ اسے محض اتفاق کہیں گے۔ لیکن گاؤں کے مذہبی لوگوں کے لئے یہ اشارہ بہت تھا۔ انھیں میری باتوں پر یقین آ گیا۔

اس رات جو طوفان آیا اس نے وادی کی فصل کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اور گاؤں کی دو اہم شخصیتوں کو بھی جان گئی تھی۔ پھر بھی گاؤں والے اس شدید نقصان کے باوجود اپنے دل میں ایک عجیب طرح کا اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ وادی پر اب تک جو شک و شبہات کا غبار چھایا ہوا تھا۔ جس سے لوگ ایک دوسرے سے آنکھیں ملاتے ہوئے ڈرتے

تھے۔ ایک دم چھٹ گیا تھا اور وادی ایسی دھلی دھلائی ہلکی پھلکی اور صاف شفاف نکل آئی تھی جیسے برسوں کے بعد اس نے آج کفارہ ادا کیا ہو۔

خود مجھے ایسا لگتا تھا جیسے قلعہ کا روپ رنگ ہی بدل گیا حالاں کہ کیا بدلا تھا، مگر ایسا لگتا تھا جیسے قلعہ کے در و دیوار سکون کے سانس لے رہے ہیں۔ گول کمرے کی تصویریں ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور قلعہ کے چاروں طرف بہنے والا پانی امن اور اطمینان سے گنگناتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ گہرا کہرا غم کا، اداسی کا اور خون بے گناہ کا جس نے ابھی تک قلعہ کے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یکایک اوپر اُٹھ کر فضا میں کہیں تحلیل ہو گیا تھا اور اس وقت قلعہ طوفان کے بعد کی کھلی دھوپ میں خوشی سے چمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا اور بالکل ویسے جیسے ہونا چاہئے تھا۔ مگر میرے دل کا سکون اور قرار چھن گیا تھا۔ کیوں کہ جسم کے نذر آتش ہو جانے اور آخری رسوم کے ادا ہو جانے کے بعد شونتی نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس دن سے وہ خواب میں نہیں آئی تھی۔

کون جانے وہ خواب تھا کہ حقیقت مگر اس دن سے وہ کبھی میرے کمرے میں نہیں آئی۔ اب اس کی روح آزاد ہو چکی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور آئے گی میرے پاس۔ ایک دفعہ تو ضرور آئے گی میرے پاس۔ اس آخری ملاقات کے خوابیدہ دھندلکوں میں لپٹا ہوا وہی وعدہ یاد تھا مجھ کو۔ تو نے کہا تھا میں ضرور آؤں گی تیرے پاس آخری بار تجھ سے مل کر جاؤں گی۔ مگر اب تیرے پنکھ تجھے مل گئے ہیں تیری رُوح آزاد فضاؤں میں گردش کر رہی ہے۔ تو اس دھرتی کی مٹی کے بیٹے کا درد کیا جانے جو باہیں پھیلا پھیلا کر رات کے سونے سناٹے میں تیرا نام لے لے کر تجھے پکارتا ہے۔ شونتی۔ شونتی۔ مگر قلعہ سے تو بھی غائب ہو چکی ہے اور تیری خوشبو بھی۔ اب مجھے اپنے ماتھے پر کسی کی کافوری انگلیوں کا لمس محسوس نہیں ہوتا۔ کوئی میرے چہرے پر جھک کر اُداس سی آہیں نہیں

بھرتا۔ وہ آنکھیں کہاں سے لاؤں جن میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ پھر تو نے وعدہ کیوں کیا تھا؟ وعدے تو اس دُنیا والے جھوٹے کیا کرتے ہیں۔ کیا عورتیں زندگی کے اس پار بھی اپنے چاہنے والوں کو اسی طرح ستاتی ہیں؟۔

دن گزرتے گئے اور دن بہ دن میرے دل کی بے چینی بڑھتی گئی اگر وہ شونتی کی روح نہیں تھیں۔ میرے ذہن اور واہمے کی کوئی متشکل مورت تھی۔ تو اس وقت میرے ذہن کی اس قدر شدید خواہش پر بھی میرے سامنے کیوں نمودار نہیں ہوئی تھی؟ میں راتوں کی تنہائیوں میں جتنی شدت اور خواہش سے اسے اپنے قریب بُلاتا۔ وہ اتنا ہی میرے تصور سے دور ہوتی جاتی۔ میرے بند کمرے کی تاریکی تاریک اور سیاہ رہتی اس میں نہ دھند کے سُرمئی مرغولے نظر آتے نہ کوئی سپید سپید ہیولا۔ نہ وہ چہرہ سفید ساڑی کے آنچل میں لپٹا ہوا۔ نہ وہ گلابی چرن کمل وہ سب غائب ہو چکے تھے۔ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے تھے۔ قلعے کا بھوت ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا۔

تو پھر اس نے وعدہ کیوں کیا تھا؟ ارے پگلے ممکن ہے یہ اس کا وعدہ نہ ہو یہ تیرا ہی وعدہ ہو تیرے اپنے ہی ذہن کے ساتھ۔ یا ممکن ہے اب وہ وہاں پر ہے جہاں سے اسے آنے نہیں دیا جاتا۔ اب وہ مکمل طور پر آزاد ہے۔ اس دُنیا کی جھنجھٹ سے مکمل طور پر کٹ چکی ہے۔ وہ پھر اب اس سنسار کی اُلجھنوں میں کیوں آنا چاہے گی۔

مگر دل نہیں مانتا تھا کہ وہ یوں وعدہ خلافی کرے گی اس لئے ہر شب کے انتظار کے بعد انتظار بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ مگر جب آٹھ دن گزر گئے۔ دس دن گزر گئے۔ پندرہ دن گزر گئے اور وہ نہیں آئی تو دل بالکل مایوس ہو گیا۔ تھک ہو کے بیٹھ گیا۔ ہر انسان کے اندر ایک خفیہ میٹر (Meter) لگا رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتا دیا کہ تیرا انتظار کرنا اب فضول ہے۔ شونتی اس قلعہ سے ہمیشہ کے لئے جا چکی اب وہ نہیں آئے گی۔

اور جب یہ یقین ہو گیا تو حسیات اور احساسات پر مایوسی، بیزاری اور تلخی کی ایک گہری دھند چھا گئی۔ دل میں ہر وقت ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ نہ کام میں جی لگتا تھا نہ بھوک لگتی تھی۔ نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آخری دنوں میں تو شیو کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھیں ہر وقت جلتی رہتی تھیں اور ذہن میں ہر وقت خاک سی اُڑا کرتی تھی اور اس کے پتلے ہوئے بگولوں میں کوئی پریشان حال چاک گریباں شونتی شونتی کہتا ہوا گھومتا تھا۔ مگر وہ میں نہ تھا۔ ہوگا کوئی اور مگر وہ میں نہیں ہوں شونتی میرا تیرا اب کیا واسطہ؟ تو نے وعدہ خلافی کی ہے تو میں بھی اب اس وادی سے چلا جاؤں گا۔ معلوم نہیں کیوں آیا تھا اس نفرت زدہ وادی میں...؟

میں نے وادی کو چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ یہاں پر کام ختم تو کیا ابھی ٹھیک سے شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ مگر اب میں اس وادی میں کام نہیں کر سکتا۔ ایک پل کے لئے رہ بھی نہیں سکتا۔ مجھے جلد سے جلد اس وادی سے نکل جانا چاہیئے۔ ورنہ یہ منحوس وادی مجھے کھا جائے گی۔

میں نے چلنے کا سارا انتظام پکا کر لیا۔ قلی۔ سرقبان۔ گھوڑے راستہ دکھانے والے سب طے کر لئے۔ دوسرے دن صبح چار بجے سب کو بلوایا اور سامان باندھ کے سب کو رخصت کر دیا۔ میں دو گھنٹے کے بعد چلوں گا۔

دو گھنٹے میں قلعہ میں اور رکا اور پھر ان تمام جگہوں پر گیا۔ جہاں جہاں شونتی کے قدم مجھے نظر آتے تھے۔ وہ کمرہ جہاں میں سوتا تھا۔ وہ غسل خانہ جہاں وہ اکثر غائب ہوتی تھی۔ وہ غلام گردش جہاں اس کے قدم پڑتے تھے۔ وہ گول کمرہ جہاں وہ ایک رات ناچی تھی وہ پینٹری جس میں اس کی لاش ملی تھی۔ میں نے دیواروں کو ہاتھ لگایا پتھروں کو چھوا اور دروازوں سے گلے ملا۔ کیوں کہ ان سب کو اس نے چھوا تھا۔ ان سب میں اس کی خوشبو تھی۔

پھر میں قلعہ سے چلا آیا۔ پھر میں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ پھر میں جنگلی راستہ کی

کی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ پھر چاروں طرف سے جنگل نے مجھے گھیر لیا پھر اُونچے پہاڑوں پر دھند بکھرنے لگی۔ پھر ہولے ہولے میرے کانوں میں ایک سریلے گیت کی آواز آئی۔

"رات کو گنگا نہیں بہتی"

میں نے چونک کر دیکھا۔ دھند کے سفید غبار میں چلتے ہوئے دو گلابی چرن مکمل سفید ساڑی اور آنچل کے ہالے میں وہ پیارا نازک چہرہ۔

"شونتی" میں نے خوشی سے چلا کر کہا۔

وہ میرے قریب آ کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ آہستہ سے اداس لہجہ میں بولی۔

"نہیں میں رتنا ہوں"

"رتنا ہو اور بول سکتی ہو؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولی۔ "میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا اگر شونتی کے قتل کے بھید سے پردہ نہیں اٹھے گا تو میں زندگی بھر نہیں بولوں گی۔ دنیا کے سامنے گونگی رہوں گی پر تیری مہربانی سے بابو شونتی کے قتل کا بھید کھل گیا۔ اس کے مارنے والوں کو سزا بھی مل گئی۔ میں تجھے دھنیہ باد دینے آئی ہوں" اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ لئے۔ میں نے تھوڑی دیر تک سہنے دیئے پھر انھیں آہستہ سے اور نرمی سے چھڑا کر بولا "ٹھیک ہے رتنا۔ ٹھیک ہے اب میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اس سے مُنہ موڑ لیا اور چلا اپنے رستے پر۔ بھلا میں اس سے کیا کہتا! وہ دیر تک مجھے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر دوڑتی بھاگتی ہانپتی میرے پیچھے چلی آئی اور ایک دم مجھے گریبان سے پکڑ کر کہنے لگی۔

"جاتے کہاں ہو"

"اپنے وطن... کیوں"؟

"نہیں" وہ سر ہلا کر بولی۔ "واپس چلو"

"کیوں؟"

اس لجا کر کہا "میری کوکھ میں تمھارا بچہ ہے۔"

"کیا کہتی ہو" میں نے غصّہ سے چلا کر کہا "یہ کیسا فریب ہے۔"

"فریب نہیں ہے بابو" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میں رتنا ....

رتنا ہی شونتی بن کر راتوں کو تمھارے پاس آتی تھی۔ وہ میں تھی۔ جو تمھارے گلے سے لگی تھی وہ میں تھی جو تمھاری بانہوں میں بار بار آتی تھی۔ وہ میں تھی جس نے راتوں کو جاگ کر تمھاری تیمارداری کی تھی۔ وہ میں جو ایک رات تمھارے سینے سے لگ کر سو گئی تھی میرے تو روم روم میں تمھارے بدن کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔"

"میں چپ!"

"لالی!" وہ سسک کر بولی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا رتنا" میری آواز سرگوشی سے اونچی نہ تھی۔

"اس لئے کہ اپنی بہن کا بدلہ لے سکوں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے گوکل داس کو شونتی کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اسے پہچانتی تھی۔ میں اسے پکڑ وا سکتی تھی مگر جب میرے باپ نے خودکشی کر لی تو میں اس گاؤں میں تنہا رہ گئی اور میری بہن کی بے حرمتی اور بے عزتی اور اس کے خون کا ذمہ دار خود میرے باپ کا بھائی اور گاؤں کا نمبردار تھا۔ اس لئے میں نے اپنے ہونٹ سی لئے اور نیم پگلی بن گئی۔ ورنہ وہ مجھے بھی ختم کر دیتے میں زندہ رہی اور چپ رہی اور سال گزرتے گئے۔ اور میں اس آدمی کا راستہ دیکھتی رہی جو اس اجاڑ ویران گاؤں میں آکر میری بہن کا بدلہ لے گا نہیں تو رتنا زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔ اور کسی سے بات کئے بنا ہی مر جائے گی۔ ایسا میں نے سوچ لیا تھا۔"

"مگر تم شونتی بن کے کیوں آئیں۔ رتنا ہو کر کیوں نہیں آئیں میرے پاس۔"

"اس لئے کہ اس قلعہ میں شونتی کی آتما تو رہتی ہی تھی۔ جہاں اس کا قتل ہوا تھا

جہاں وہ بنا کریا کرم کے دبا دی گئی۔ وہاں سے وہ کیسے جاتی وہ شنکر کو خواب میں آکر ستاتی تھی۔ اور دوسرے لوگ جو قلعہ میں آکر رہتے تھے انھیں خواب میں آتی تھی۔ مگر وہ لوگ دو ایک دن کے لئے کبھی کبھار سال دو سال میں آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ پھر شنکر خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ قلعہ میں کوئی رہے۔ اسے ڈر تھا کہیں کوئی سچی کھری ہمدردی بھری آتما رکھنے والا آدمی اس قلعہ میں آگیا تو شونتی کی آتما اس سے سب کہہ دے گی اور اس کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اس لئے تو جب تم پہلے روز مندر میں آئے اور تم نے مجھے دیکھ کر شنکر سے کہا "یہ تو وہی لڑکی ہے جو رات کو مجھے خواب میں آئی تھی" تو اس دن میں نے تہیہ کر لیا کہ اب میں خود شونتی کی آتما کے روپ دھار کے تمھارے پاس جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ اس کی آنکھیں جواب تک مجھے دیکھ رہی تھیں نیچے جھک گئیں۔ اس نے آہستہ سے ایک آہ کو دباتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا اگر تم شونتی سے پیار کر لو گے تو پھر ضرور اس کے قتل کا بدلہ لو گے۔"

"بہت حالاک نکلیں تم" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ لیکن یہ تو بتاؤ تم قلعہ کے اندر آتی کس طرح تھیں قلعہ کے سارے دروازے میں خود اندر سے بند کر دیتا تھا۔"

رتنا کی آنکھوں میں شوخی کی چمک تیرنے لگی۔ بولی "ادھر جدھر قلعہ کے پرانے زنان خانے کا ملبہ گرا ہے جہاں پر تین سیڑھیاں ہیں وہیں پر ایک تہ خانہ ہے جس کا راستہ قلعہ کے اندر سے ہو کر اندر ہی اندر مندر تک جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں رانیاں اسی راستہ سے مندر آیا جایا کرتی تھیں۔ اب وہ راستہ کسی کو معلوم نہیں۔ صرف مندر کے پجاری کو معلوم ہوتا ہے۔ وہ راستہ میرے باپ نے مجھے مرنے سے پہلے بتا دیا تھا....."

"اور وہ خوشبو"

رتنا نے اپنی ساڑھی کے آنچل کا ایک کونہ جس میں گرہ پڑی ہوئی تھی، کھولا۔ اس میں چند چھوٹی چھوٹی خشک جڑیں رکھی ہوئی تھیں رتنا نے ان جڑوں کو ہاتھ میں لے کر تھوڑی دیر تک مسلا۔ پھر اپنا ہاتھ میری ناک کے قریب لائی۔ میں اسے سونگھتے ہی ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ وہی تیز کافوری خوشبو، میرے نتھنوں میں آئی تھی۔ میرا سر چکر کھانے لگا تھا۔

اسے خوب اچھی طرح سونگھنے سے آدمی بے ہوش سا ہو جاتا ہے نہ ہل سکتا ہے ہاتھ ہلا سکتا ہے دیکھتا بھی کم ہے سُنتا بھی کم ہے۔ اور باتیں بھی آہستہ آہستہ ہی کر سکتا ہے جیسے کوئی کنوئیں کے اندر سے بولے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی" لیکن میرے پاس اس کا توڑ بھی موجود ہے جسے ذرا سامنہ میں رکھ دو تو اس خوشبو کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"تم شاید وہی بوٹی کھا کے آتی تھیں اور خود مجھے یہ دوسری بوٹی سنگھاتی تھیں؟" اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

میرا سر اس خوشبو کے ایک ہی جھونکے سے چکرا رہا تھا۔ میرے چاروں طرف دھند سی بکھرنے لگی تھی۔ سفید ساڑھی کے آنچل کے ہالے میں وہ سفید سُنتا ہوا چہرہ مجھے اک عجب دلدوز التجا سے دیکھتا ہوا نظر آیا وہ ہونٹ کسی اندرونی کرب سے کانپنے لگے آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اس لمحے میں مجھے بالکل شونتی نظر آئی۔

"شونتی" میں نے اس سے کہا" میں تمھیں شونتی کہوں؟"

وہ بولی" رتنا تو اس دن کے لئے زندہ تھی جس دن وہ اپنی بہن کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھے گی۔ اب میں۔ تمھاری بانہوں میں آنے کے بعد، میں رتنا نہیں ہوں۔ شونتی ہوں تمھاری شونتی ہوں سے تمھاری شونتی۔"

اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور اپنے پھول سے ہونٹ میرے لبوں سے لگا دیئے مگر یہ ہونٹ خواب کے ہونٹ نہیں تھے۔ اور انھیں چومتے ہوئے شونتی کو اپنی بانہوں میں لپٹاتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے میرے پاؤں دھرتی پر

آ گئے ہیں اور جو ہے سو ہے وہ نقلی نہیں وہ اصلی ہے سندر ہے، مکمل ہے اور تخلیق کے درد سے روشن ہے۔

داستان ختم کر کے موتی لال ناگر چپ ہو گیا۔

وہ تینوں نسیم کے گھر کو جانے والی گھاٹی کے راستے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں سے اوپر نسیم کا کاٹج پورا تو نظر نہیں آتا تھا۔ صرف اس کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ دائیں طرف والا حصہ، باغیچے سے گھرا ہوا۔

ناگر کے پاس شونتی بیٹھی تھی۔ آج بسنت کا دن تھا۔ وادی میں چاروں طرف پیلے پیلے پھول کھلے تھے۔ شونتی نے بھی پیلے رنگ کی بسنتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔

اکرم نے مسکرا کر کہا" اور نسیم؟"

"وہ دن بہ دن بدمزاج اور چڑچڑی ہوتی جا رہی ہے"۔ موتی لال ناگر نے اکرم سے کہا" نہ کسی سے ملتی ہے نہ بات کرتی ہے ہم لوگوں سے تو اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہم دونوں کو اکٹھے دیکھتے ہی گالیاں سُنانے لگتی ہے۔ اس لئے اب ہم اس کے ہاں نہیں جاتے۔"

"کہتی کیا ہے" اکرم کا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"کہتی ہے جس کو دس سال دیئے زندگی کے۔ اسی کے لئے باقی زندگی بھی تج دونگی اسی وادی میں میرا مزار بھی بنے گا۔"

"دیکھا جائے گا" اکرم یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے خیال میں تمھارا جانا بیکار ہے۔"

اس نے میری طرف دیکھا پھر ایک پھیکے سے تبسم کے ساتھ بولا" مگر میں جاؤں گا۔"

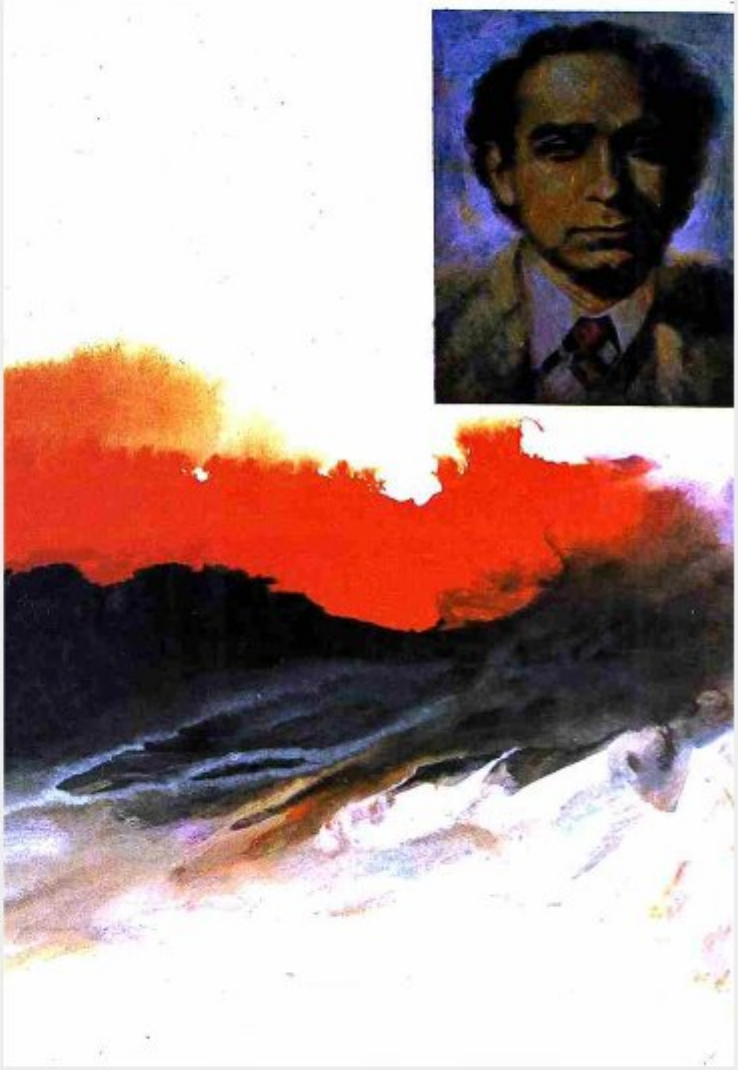

وہ آگے آگے چلنے لگا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے ذرا فاصلے پر چلنے لگے گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے اس سے کہا "وہ دیکھو پورٹیکو میں بیٹھی ہے آرام کرسی پر۔ بس اب تم جاؤ ہم آگے نہیں جاسکتے۔"

اکرم کانپتے کا پُرانا چوبی گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا اور سلیٹی بجری کی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ جو پورٹیکو کو جاتی ہے۔

اس کے قدموں کی.... چاپ سُن کر نسیمہ نے چونک کر اور نگاہ اُٹھا کر اس کی جانب دیکھا بہت دیر تک وہ دھیرے دھیرے مگر مضبوط قدموں سے اکرم کو بجری کے راستے پر چلتے ہوئے اپنے پورٹیکو کی طرف آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ پھر دونوں بانہیں پھیلا کر اس کی طرف بھاگی۔

"اکرم ــــ اکرم ــ"

بیچ راستہ میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔ اکرم نے اسے اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا اور وہ مارے خوشی کے دیوانی ہو کر اس سے لپٹی جا رہی تھی۔

میں نے شونتی کی کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلو گھر چلیں.... ابھی تھوڑی دیر میں نسیمہ دوڑی دوڑی آئے گی کہے گی 'بھیا بھیا جلدی سے میرے نکاح کا بندوبست کرو'۔"

ختم شُد